© rasailojaraid.com

پروفیسر ظفر احمد

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

السیرۃ النبویۃ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
تحقیقی و توقیتی مطالعہ (حصہ جدلیات)
تیسویں قسط
فتنۂ انکارِ حدیث تشقیق جدلی کی زد میں

چھٹا حصہ: قرآن کریم کو کھلونا بنانے کے پرویزی انداز

ترجمے کی بہ جائے قرآن کا مفہوم بیان کرنے کے اصل مقاصد

قرآنی آیات کے ترجمے میں لازماً قرآنی کلمات والفاظ کو الگ الگ ملحوظ رکھنا ہوگا۔ چوں کہ اس سے کتاب اللہ کی معنوی تحریف میں بڑی حد تک دقت پیش آتی ہے، اس لیے قرآن کریم کی من پسند معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ ترجمے کی بہ جائے ''مفہوم'' کی آڑ میں وہ جو چاہتے ہیں قرآن کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور لوگوں کو خوب خوب فریب دیتے ہیں کہ انہیں قرآن سمجھایا جارہا ہے۔ ہم مثلاً سورۂ فاتحہ کو لیتے ہیں۔ ترتیب توقیفی کے اعتبار سے قرآن کریم کی یہ سب سے پہلی سورت ہے، جسے ام القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورت کی آیات کے صحیح ترجمے کے ساتھ ہم پرویزی ''مفہوم'' کا تقابل پیش کرتے ہیں تاکہ اس حقیقت پر پوری طرح مہر تصدیق ثبت ہوسکے کہ پرویزی منکرین حدیث کا قرآن کریم سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں نے کتاب اللہ کو بازیچہ اطفال بنا رکھا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ O مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ O
اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ O اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ O صِرَاطَ
الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ O عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

۱۔اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O۔ ’’سب تعریف اللہ کے لیے جو سب جہانوں کا پرودگار ہے‘‘

پرویزی مفہوم: ’’زندگی کا ہر حسین نقشہ اور کائنات کا ہر تعمیری گوشہ خالقِ کائنات کے عظیم القدر نظام ربوبیت کی ایسی زندہ شہادت ہے جو ہر چشم بصیرت سے بے ساختہ دادِ تحسین لے لیتی ہے‘‘۔

یاد رہے کہ پرویزی اصطلاح میں نظام ربوبیت سے اشتراکی نظام معیشت مراد ہوا کرتا ہے جس میں تمام ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں ہوتے ہیں اور کسی شخص کی کوئی نجی ملکیت نہیں ہوتی۔

۲۔الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ O ’’جو بے حد رحم کرنے والا (اور) نہایت مہربان ہے‘‘۔

پرویزی مفہوم: وہ نظام جو تمام اشیا کائنات اور عالم گیر انسانیت کو ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما سے تکمیل تک لیے جارہا ہے۔ عام حالات میں بہ تدریج اور ہنگامی صورتوں میں انقلابی تغیر کے ذریعے‘‘۔

۳۔مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ O ’’انصاف کے دن کا (یعنی قیامت کے دن کا) مالک ہے‘‘۔

پرویزی مفہوم: ’’ انسان کو یہ تمام نشوونما بلا مزدو معاوضہ ملتا ہے لیکن اس کی ذات کی نشوونما اور اس کے مدارج کا تعین اس کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے جس کے نتائج خدا کے اس قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوتے ہیں جن پر اسے کامل اقتدار حاصل ہے‘‘۔

۴۔اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ O ’’ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے (امورِ غیر عادیہ یا غیر اختیاری امور میں) مدد مانگتے ہیں‘‘۔

پرویزی مفہوم: اے عالم گیر انسانیت کے نشوونما دینے والے! ہم تیرے اسی قانونِ عدل وربوبیت کو اپنا ضابطۂ حیات بناتے اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق اپنی صلاحیتوں کی بھرپور اور متناسب نشوونما کر سکیں اور پھر انہیں تیرے ہی بتائے ہوئے طریق کے مطابق صرف کریں‘‘۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۔ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ O "ہمیں سیدھے راستے پر چلا"

پرویزی مفہوم: ہماری آرزو یہ ہے کہ یہ پروگرام اور طریق جو انسانی زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جانے کی سیدھی اور متوازی راہ ہے نکھر اور ابھر کر ہمارے سامنے آجائے"۔

۶۔ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ O "ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے"

پرویزی مفہوم: یہ ہی وہ راہ ہے جس پر چل کر پچھلی تاریخ میں سعادت مند جماعتیں زندگی کی شادابی و خوش گواری، سرفرازی و سربلندی اور سامانِ زیست کی کشادگی و فراوانی سے بہرہ یاب ہوئی تھیں"

۷۔ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ O " نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر (تیرا) غضب ہوا ہے اور نہ ہی گم راہوں کا"

پرویزی مفہوم: اور ان کا انجام سوختہ بخت اقوام جیسا نہیں ہوتا تھا جو اپنے انسانیت سوز جرائم کی وجہ سے یک سر تباہ اور برباد ہوگئیں یا جو زندگی کے صحیح راستہ سے بھٹک کر اپنی کوششوں کو نتائج بدوش نہ بنا سکیں اور اس طرح ان کا کاروانِ حیات ان قیاس آرائیوں کے سراب اور توہم پرستیوں کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا"۔[1]

جس بے دردی اور شقاوتِ قلبی سے مسٹر غلام احمد پرویز نے قرآن کریم کی معنوی تحریف کی تقریباً ہر موقع اور مقام پر سعی نامشکور فرمائی ہے۔ اس پر ایک صاحب نے برمحل اور موزوں تبصرہ پرویز صاحب کے ایک عقیدت مند سید نصیر شاہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے۔ اسے خود منکرین حدیث کے مجلے طلوع اسلام میں یوں پیش کیا گیا ہے:

> آپ کے مشورے پر معارف القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر اس کی پہلی ہی جلد نے میرا جی جلا دیا ہے۔ غضب خدا کا تفسیر بالرائے کی ایسی بھونڈی مثالیں نہ کبھی دیکھیں نہ سنیں، چلتے چلتے ایک لفظ کی طرف اشارہ کرتا ہوں، سن لیجیے کہ آپ کے پرویز صاحب کیسے کیسے حیلوں سے تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ ایک لفظ "الاء" جو سورۂ رحمن میں تکرار کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ سلف سے خلف تک سب مفسرین اس پر متفق ہیں کہ اس کے معنی نعمت ہیں، مگر وہ (پرویز صاحب) اس کے معنی "قدرت" کر دیتے ہیں۔ اب کہیے کہ

۱۔ غلام احمد پرویز۔ مفہوم القرآن: سورۂ فاتحہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی تفسیر کو اگر جائز رکھا جائے تو قرآن بچوں کا کھیل بن جاتا ہے یا نہیں کہ جو آئے اسے مروڑ دے۔[۲]

قرآنی آیات کے ترجمے میں خود ساختہ اور غیر متعلق اضافہ

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک مکروہ پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ قرآنی آیات کے ترجمے میں اپنی طرف سے الفاظ ڈال کر آیت کے صحیح مفہوم کو بدلتے ہوئے قارئین کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ انہیں اللہ کا کلام سنایا جارہا ہے، مثلاً:

الف۔ يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ[۳]

اے انسان تو سخت دشوار گذار منازل طے کرتا ہوا خدا کے نظام ربوبیت کے سامنے جا کھڑا ہوگا۔

یہاں ترجمے میں جناب پرویز نے کلمات "خدا کے نظام ربوبیت" کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا ہے۔

ب۔ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ[۴]

کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو جو دنیا میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ہمارے قانون ربوبیت پر ایمان لاتے ہیں اور ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیا وہ لوگ جو اپنی معاشی زندگی کو ہمارے قانون سے الگ رکھتے ہیں (فجار) ان لوگوں کے برابر ہو جائیں گے جو اس زندگی کو ہمارے قانون سے ہم آہنگ رکھتے ہیں۔[۵]

یہاں "قانون ربوبیت، معاشی نظام" جیسے کلمات کا پرویز نے اپنی طرف سے ترجمے میں اضافہ کر ڈالا اور مفسدین کا ترجمہ "ناہمواریاں پیدا کرنے والے" اور متقین کا معنی "ہمواریاں پیدا کرنے

۲۔ طلوع اسلام: جون ۱۹۵۸ء

۳۔ غلام احمد پرویز۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۶۸۵

۴۔ سورۃ ص۔ آ۔ ۲۸

۵۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۴۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والے "لکھ دیا ہے۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے "کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان لوگوں کے برابر کردیں گے جو زمین میں فساد مچانے والے ہیں یا کیا ہم پرہیزگاروں کو نافرمانوں کے برابر کردیں گے؟"۔

خودساختہ نظام ربوبیت کی نامعقول تکرار

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک مکروہ اور مضحکہ خیز انداز یہ بھی ہے کہ اپنے نام نہاد "قرآنی نظام ربوبیت" کو ثابت کرنے کے لیے پرویز صاحب "نظام ربوبیت، قانون ربوبیت وغیرہ" کو ناحق متعدد قرآنی کلمات کا معنی قرار دینے میں ذرا بھی شرمندگی محسوس نہیں فرماتے۔ مثلاً ہم گذشتہ مباحث میں "عقائد اسلام اور پرویزی منکرین حدیث" کے ذیلی عنوان "اللہ پر ایمان" کے تحت بیان کرچکے ہیں کہ خودساختہ پرویزی لغت میں "اللہ" کا معنی "نظام ربوبیت، اللہ کا قانون، قانونِ خداوندی، اللہ کا نظام، صفاتِ خداوندی" ہے۔ "اللہ و رسول" کا معنی "مرکز ملت" ہے اور "ارکان اسلام اور پرویزی منکرین حدیث" کے ذیلی عنوان "اسلام کی پرویزی تعریف" کے تحت ہم بیان کرچکے ہیں کہ پرویزی لغت میں "رب" کا معنی "خدا کی ربوبیت" ہے۔ "قرآن" کا معنی "قانون ربوبیت" ہے۔ "دین" کا معنی "نظام ربوبیت" ہے۔ "بینہ" کا معنی "قانون ربوبیت" ہے۔ "آیات" کا معنی بھی "قانون ربوبیت ہے"۔ "اسلام" کا پرویزی معنی "نظام ربوبیت کا قیام" ہے۔ لفظ "ربانیون" کا معنی "نظام ربوبیت کی حامل جماعت" ہے۔[۶]

قرآنی کلمات کو خودساختہ اور باہم متضاد و متبائن معانی پہنانا

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ پرویز صاحب قرآنی کلمات اور الفاظ کے اصل معانی کے ساتھ انہیں اپنی طرف سے خودساختہ مفاہیم اور معانی بھی پہناتے چلے جاتے ہیں، اور حسب ضرورت مختلف مواقع پر اپنے ان خودساختہ مختلف معانی کو قرآن پر چسپاں کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب کا مضمون ہے۔ مثلاً ہم گذشتہ مباحث میں ارکانِ اسلام کے تحت بتاچکے ہیں کہ پرویز صاحب نے اقامتِ صلوٰۃ (نماز قائم کرنے) کے اتنے معانی بیان کیے ہیں جن کا نہ

۶۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۷۵، ۱۱۷، ۱۸۰، ۱۲۵، ۲۵۸، ۲۱۵، ۱۹، ۹۴، ۱۴، ۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف باہم کوئی ربط تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے بل کہ قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ثابت اقامتِ صلوٰۃ کے اس صحیح مفہوم سے ان کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں جوامت میں قرآن ہی کی طرح تواتر و تسلسل سے چلا آرہا ہے۔ اور مثلاً ہم نے عقائدِ اسلام کے تحت ایمان بالملائکہ (فرشتوں پر ایمان) کے سلسلے میں لفظ ملائکہ کے متعدّد پرویزی معانی بیان کیے ہیں، جو سراسر پرویز صاحب کے خود ساختہ ہیں اور ملائکہ کے اس معنی و مفہوم سے اکثر و بیشتر ان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا جو امت میں تواتر سے چلا آرہا ہے۔ اور مثلاً لفظ "جن" کو لیجیے۔ اس کا ایک مفہوم مسٹر پرویز نے یوں بیان کیا ہے "ہر وہ قوت جو انسانی نگاہوں سے اوجھل ہو جن کہلاتی ہے اور انسانی جذبات چوں کہ آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے اس لیے اس اعتبار سے انہیں جن کہا گیا ہے"۔[۷] جن کا ایک اور مفہوم پرویز صاحب نے یہ لکھا ہے "جن" ایک آتشین مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ لفظ جن کے معنی ہیں پوشیدہ، مستور، اوجھل، غیر مرئی، جب یہ کرۂ ارض سورج سے جدا ہوا تو ایک پگھلا ہوا آتشین مادہ تھا۔ تبدیل وتحول کے بعد ابتدائی دور میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن وہ مخلوق اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی۔ اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے"۔[۸] اسی لفظ جن کا ایک اور مفہوم پرویز نے یہ بیان کیا ہے:

> جن ؓ وانس انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہیں۔ اِنس شہروں کی مہذب آبادی اور جن ؓ صحرا کے بادیہ نشین جو شہری آبادی کی نگاہوں سے اوجھل اور بیابانوں میں رہتے ہیں لہٰذا قرآن کریم میں جہاں جن ؓ وانس کا ذکر ہوگا ان سے مراد انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہوں گی۔[۹]

مختلف قرآنی آیات اور ان کے اجزا سے اپنے مطلب کی مربوط عبارت تیار کرنا

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک نہایت ہی مکروہ اور شرم ناک انداز یہ ہے کہ قرآن کریم کی متعدّد آیات اور ان کے اجزا کو سیاق وسباق سے یک سر کاٹتے ہوئے اور انہیں اپنی طرف سے خود ساختہ مفہوم پہناتے ہوئے پرویز صاحب ایک مربوط عبارت تیار کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو دھوکے میں رکھتے ہوئے یہ باور کراتے ہیں کہ انہیں اللہ کا کلام سنایا اور سمجھایا جارہا ہے۔ مثلاً "عقائد اسلام اور

۷۔ غلام احمد پرویز۔ آدمؑ و ابلیس: ص ۹۰

۸۔ ایضاً: ص ۹۷

۹۔ ایضاً: ص ۱۰۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرویزی منکرین حدیث" کے ذیلی عنوان "آخرت پر ایمان" کے تحت ہم اس کی مثال پیش کر چکے ہیں کہ سورۂ عبس، سورۂ مدثر، سورۂ اعراف، سورۂ نحل اور سورۂ بلد سے بعض آیات اور ان کے اجزا سے جناب غلام احمد پرویز نے ایک مربوط عبارت تیار کر کے اسے اپنے خود ساختہ نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) پر چسپاں کر دکھایا ہے، حال آں کہ ان قرآنی آیات میں سے اکثر آیات کا تعلق اخروی مناظر سے ہے ان کا کسی بھی طرح کے نظام معیشت سے دور دور کا (پھر دہرایے) دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

معنیٰ میں عموم کو نظر انداز کرنا یا مطلق حکم کو قیودِ فاسدہ سے مقید کرنا

قرآن کریم میں معنوی تحریف کا ایک مکروہ پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ کسی لفظ کے معنی میں عموم ہو لیکن اپنی اغراضِ فاسدہ کے تحت صرف اس کے خاص مفہوم کے صحیح ہونے پر ہی اصرار کیا جائے یا کوئی شرعی حکم مطلق ہو تو اس میں اپنی طرف سے قیود (Limitations) لگا کر اسے ناحق مقید کر دیا جائے۔ مثلاً:

الف: مفردات القرآن میں "نحرا البعیر" کا معنی لکھا ہے کہ اونٹ کے سینے میں برچھا مار کر اسے ذبح کیا جائے۔ لیکن "نحر" کے معنی میں عموم ہے اس سے کسی بھی جانور کا ذبح کرنا مراد ہے۔ المنجد میں ہے: نحر البھیمۃ: اصاب نحرھا، ذبحھا من نحرھا یعنی "چوپائے کے بالائے سینے پر زخم لگایا۔ اسے سینے کے اوپر والے حصے سے ذبح کیا"۔ چناں چہ سورۂ کوثر میں وانحر کے معنیٰ میں عموم ہے کہ "تو قربانی کر"۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ "تو صرف اونٹ کی قربانی کر"۔ اس کے برعکس جناب غلام احمد پرویز نے لکھا ہے:

> اس سورہ میں آپ کو اونٹ کی قربانی کا حکم دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ ہجرت کر کے مدینے جا رہے تھے۔ وہاں یہود آباد تھے اور ان پر اونٹ حرام تھا۔ ان کے ساتھ سمجھوتے کی صورت میں ان کے جذبات کا احترام ضروری تھا لیکن قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ان سے سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ ان کے علی الرغم اونٹوں کو ذبح کیا جائے گا۔ (۱۰)

۱۰۔ محمد اسلم جیراجپوری و غلام احمد پرویز۔ قرآنی فیصلے: ص ۶۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ یہودیوں سے سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا لیکن رسول اللہ ﷺ نے تو مدینے جاتے ہی یہودیوں سے معاہدہ کیا جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے لیکن اس میں اونٹ یا کسی بھی جانور کی قربانی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی اس طرح کے امور میں یہودیوں نے مسلمانوں سے کوئی معاندانہ جھگڑا کیا تھا، چناں چہ اس سمجھوتے کا اونٹ کی یا کسی بھی جانور کی قربانی سے کوئی تعلق نہیں۔

الغرض سورۂ کوثر میں قربانی کا حکم عام ہے۔ اس میں اونٹ کے علاوہ دوسرے جانوروں گائے بھیڑ بکری کی قربانی بھی شامل ہے۔ نیز اس میں عام قربانی کے علاوہ عید الاضحیٰ کی قربانی بھی داخل ہے جو امت میں اسی طبقاتی و عملی تواتر سے ثابت ہے جس طبقاتی و عملی تواتر سے قرآن کریم کا ہم تک صحیح حالت میں پہنچنا ثابت ہے تو کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم کا تواتر سے پہنچنا تو منکرین حدیث کو قبول ہے لیکن اسی تواتر سے جو دیگر دینی امور امت تک منتقل ہوتے چلے آئے ہیں وہ کیوں قبول نہیں؟

ب: سورۂ طلاق میں ہے: وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ[11] ”اور (تمھاری مطلقہ عورتیں) جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آیا ہی نہیں اور حمل والی عورتوں کی عدت وضعِ حمل ہے“۔ مذکورہ بالا آیت میں ان عورتوں کی عدت بھی تین ماہ ہے، جنہیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا۔ اس سے نابالغ خواتین کے نکاح کا جائز ہونا ثابت ہو رہا ہے کیوں کہ طلاق اور عدت کا مسئلہ ان کے لیے تب ہی تو پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ شادی شدہ ہوں۔ حیض نہ آنے کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کم عمری کی وجہ سے حیض نہ آئے، کسی عارضے کی وجہ سے کافی عمر تک حیض نہ آئے، ساری عمر ہی حیض نہ آئے، بڑھاپے کی وجہ سے حیض کا آنا بند ہو چکا ہو۔ ان میں سے آخری صورت کا ذکر تو آیت کے مضمون ”اور جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں“ میں الگ کر دیا گیا ہے۔ حیض نہ آنے کی باقی تینوں صورتوں کو لَمْ یَحِضْنَ کے حکم سے شامل کیا گیا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ نابالغ اور کم عمر لڑکی کا نکاح شرعاً درست ہے۔ لیکن منکرین حدیث وغیرہ کا اس پر ناحق اصرار ہے کہ یہاں لَمْ یَحِضْنَ سے وہ عورتیں مراد ہیں جو سن بلوغت کو تو پہنچ چکی ہوں لیکن کسی عارضے سے انہیں حیض نہ آیا

۱۱۔ الطلاق: ۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو۔ یہاں ان کا غلط استدلال یہ بھی ہے کہ آیت میں نساء یعنی عورتوں کا ذکر ہے اور نسا کا لفظ نابالغ بچیوں پر نہیں بولا جاتا۔ یہاں بھی رجال اور نسا کے معنی میں جو عموم ہے، اسے ان حضرات نے ناحق بالغ مردوں اور عورتوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ حال آں کہ کلام کے سیاق و سباق کے اعتبار سے نابالغ بچے اور بچیاں بھی رجال اور نسا کے مفہوم میں بہ خوبی داخل ہیں۔ سورۂ نسا کی پہلی آیت میں ہے کہ "اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی (حوّا) کو پیدا کیا وبثّ منھما رجالاً کثیرا ونساء [۱۲] "اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (زمین میں) پھیلا دیں"۔ غور کیجیے یہاں رجال اور نسا سے صرف بالغ مرد اور عورتیں ہی مراد نہیں بل کہ نابالغ بچے اور بچیاں بھی اس میں داخل ہیں ورنہ یہ لغو بات ماننی ہوگی کہ نابالغ بچے اور بچیاں تو آدمؑ و حوا کی اولاد نہیں، لیکن جوں ہی وہ بالغ ہو جائیں تو آدمؑ و حوا کی اولاد کہلائیں گے۔

یتیم بچوں کے متعلق سورۂ نساء میں ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ ۔ [۱۳] "اور تم یتیموں کو سدھارتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں (بالغ ہو جائیں) پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو"۔ نکاح کی عمر کو پہنچنا یا بالغ ہونا اور نکاح کا منعقد ہونا دونوں میں فرق ہے۔ نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے اولیا کے ذریعے منعقد ہوتا ہے۔ اس میں اور نکاح کی عمر کو پہنچنے یعنی بالغ ہونے میں جو فرق ہے، اسے نظر انداز کرتے ہوئے بچپن کے نکاح کو شرعاً ناجائز ٹھہرانا صحیح نہیں ہے۔ لین دین کے معاملات کے متعلق سورۂ بقرہ میں ہے فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ [۱۴] "پھر اگر قرض لینے والا بے عقل ہو یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے"۔ اسی سورۂ بقرہ میں چھوٹے بچے کے لیے ضعیف کا لفظ آیا ہے وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاۗءُ [۱۵] یعنی "اس کے چھوٹے چھوٹے بچے

۱۲۔ النساء:۱

۱۳۔ النساء:۶

۱۴۔ البقرہ:۲۸۲

۱۵۔ البقرہ:۲۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں"۔ جس طرح لین دین کے معاملات میں چھوٹے بچے اور بچیوں کے عقود و معاملات کا انعقاد ان کے منعقدہ ولی کے ذریعے ہوتا ہے یہ ہی حال ان کے نکاح کے انعقاد کا بھی ہے۔

ج: سورۂ نسا میں ہے: وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانْكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ‌ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكَ اَدۡنٰۤى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا [۱۶] "پھر اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو تم اور عورتوں سے جو بھی تمہیں پسند ہوں نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں (بیویوں میں) انصاف قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمھاری ملکیت کی لونڈی، یہ زیادہ قریب ہے کہ ایسا کرنے سے تم ایک طرف جھک پڑنے (یعنی ناانصافی) سے رک جاؤ"۔

آیت مذکورہ کی تفسیر حضرت عائشہؓ سے اس طرح مروی ہے کہ اگر مال دار اور خوب صورت یتیم لڑکی کسی ولی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ اس کے مال اور حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس سے نکاح تو کر لیتا لیکن اسے دوسری عورتوں کی طرح پورا حق مہر نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے یتیم لڑکیوں کے اولیا کو اس ظلم سے روکا کہ اگر گھر کی یتیم بچیوں کے ساتھ نکاح کی صورت میں ان سے ناانصافی کا تمہیں خدشہ ہو تو ان سے نکاح ہی نہ کرو بل کہ دوسری عورتوں سے نکاح کا راستہ کھلا ہے۔[۱۷] بل کہ ایک سے زائد چار عورتوں تک سے بھی نکاح کر سکتے ہو بہ شرطے کہ ان میں باہم انصاف کو ملحوظ رکھ سکو ورنہ ایک ہی عورت سے نکاح کرو یا اس کی بہ جائے لونڈی کو کافی سمجھو۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں اس امر کا قوی خدشہ موجود ہوتا ہے کہ جس کی طرف قلبی میلان زیادہ ہو تو ضروریات زندگی کی فراہمی میں بھی اس کی طرف توجہ زیادہ ہو اور دوسری بیویوں کی حق تلفی ہو۔ اس ناانصافی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ایسی صورت میں ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرو۔ بیویوں میں انصاف سے مراد یہ ہے کہ اپنی استطاعت اور اختیار کے مطابق اس کا اہتمام کرو ورنہ ہر کسی سے سو فیصد انصاف انسانی اختیار سے باہر ہے۔ چناں چہ اسی سورت میں ہے: وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ‌ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ [۱۸] "اور تم ہرگز اس کی طاقت نہیں رکھو گے کہ بیویوں کے درمیان

۱۶۔ النساء:۳

۱۷۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۱۵۳۔ ۱۵۴، ارقم ۶۸۶۷۔ ۶۸۶۸

۱۸۔ النساء:۱۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انصاف کر سکو اگر چہ تم اس کا پورا اہتمام بھی کرو بس (انصاف کا مطلب یہ ہے کہ) تم ایک ہی (بیوی کی) طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیویوں کو بیچ میں لٹکا رکھو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا اور پھر ان کے ساتھ انصاف نہ کرنا ظلم ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ بیویوں میں انصاف کر سکو تو چار عورتوں تک نکاح کی مردوں کو عام اجازت ہے۔ لیکن منکر حدیث غلام احمد پرویز نے اس اجازت کو اپنی طرف سے "ہنگامی حالات اور یتیموں اور بیواؤں کی کثرت" سے محدود کر دیا ہے۔ چناں چہ پرویز نے لکھا ہے:

> مطلب صاف ہے کہ اگر کسی ہنگامی حالت مثلاً جنگ کے بعد جب جواں مرد بڑی تعداد میں ضائع ہو چکے ہوں۔ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور لاوارث جوان عورتیں بغیر شوہروں کے رہ جائیں، اس کا علاج کیا ہے؟ اس ہنگامی صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ تعدّدِ ازدواج یعنی ایک بیوی کے قانون میں عارضی طور پر لچک پیدا کر لی جائے۔[19]

اب دیکھیے "ہنگامی صورت، ایک بیوی کے قانون میں عارضی طور پر لچک" کا مفہوم مذکورہ آیت میں پرویز نے اپنی طرف سے داخل کر دیا ہے۔ آیت میں تو یہ ہے کہ یتیم بچیوں کے اولیا کو ان سے نکاح کرنے میں اگر ناانصافی کا اندیشہ ہو تو وہ دوسری عورتوں سے حتی کہ چار عورتوں تک سے نکاح کر سکتے ہیں بہ شرطے کہ ایک سے زائد بیویوں میں انصاف قائم رکھ سکو ورنہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کر و یا پھر لونڈی پر گزارہ کرو۔ آیت میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ اگر بیواؤں اور یتیم لڑکیوں کی بہتات ہو تو ایک سے زائد نکاح کر سکتے ہو ورنہ نہیں، یہاں شرط یتیموں اور بیواؤں کی کثرت نہیں بل کہ صرف اور صرف بیویوں میں انصاف قائم رکھنے کی شرط ہے۔ مگر جناب پرویز صاحب نہایت بے باکی سے کتاب اللہ کی معنوی تحریف سے کام لیتے ہوئے من پسند مطلب کشید کر رہے ہیں۔ آیت کا صحیح مطلب بالکل واضح ہے کہ جب تمہیں چار عورتوں تک سے نکاح کی عام اجازت ہے تو تم اپنی زیر کفالت ایسی یتیم بچیوں سے ہی نکاح کی خواہش کیوں کرتے ہو جن سے نکاح کی صورت میں ان سے ناانصافی کا اندیشہ ہو۔ چناں چہ اگر دوسری عورتوں سے نکاح میں بھی ناانصافی کا اندیشہ بحال رہے تو صرف ایک ہی عورت سے نکاح کرو یا لونڈی پر گزارہ کرو۔

۱۹۔ غلام احمد پرویز۔ طاہرہ کے نام خطوط: ص ۳۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں یہ یاد رہے کہ کسی قول و فعل کو شرعاً جائز قرار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ جائز قرار دینے والا اس قول و فعل کو عملی زندگی میں بروئے کار لانے کی ترغیب بھی دیتا ہے یا اس پر اصرار کرتا ہے۔ مثلاً ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے کی ترغیب بھی دی ہے یا اس پر اصرار فرمایا ہے کہ اسے ضرور کھایا کرو یا اگر مسلمان کا ذبیحہ آسانی سے دستیاب ہو تو بلا وجہ اہل کتاب کا ذبیحہ تلاش کیا کرو۔ اسی طرح ایک سے زائد یعنی چار عورتوں تک سے بہ یک وقت نکاح یا نابالغ بچے اور بچی کے نکاح کی اجازت کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ امور ہر حال میں لازماً پسندیدہ بھی ہیں۔ اگر اسلامی معاشرے میں جہالت پر مبنی رسوم و رواج کی بنا پر اس طرح کے امور میں شرعی اجازت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ظلم کی راہ ہموار کی جائے اور حقوق العباد کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ظلم اور حق تلفی کو روکنے کے لیے اسلامی ریاست خاص حالات میں جو تدابیر اختیار کرے وہ اس کی مجاز ہوگی۔ تاہم جواز کا شرعی حکم تو بہ ہر حال فی نفسہٖ (بہ ذات خود) برقرار ہی رہے گا۔ کسی جائز کام کو ناجائز اور حلال چیز کو حرام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

د: سورۂ محمد میں جنگی قیدیوں کے متعلق ہے: فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ٭ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا[20] "پھر جب تمھاری کافروں سے مڈ بھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم انہیں خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں) انہیں مضبوطی سے قید کر لو پھر اس کے بعد یا تو احسان کرو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو"۔ یہاں مَنّ (احسان) اور فدیہ دونوں کی تین تین صورتیں ہیں۔ مَنّ (احسان) کی پہلی صورت یہ ہے کہ جنگی قیدیوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ چناں چہ سورۂ دہر میں نیک لوگوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے: وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّ اَسِیۡرًا[21] "اور وہ اس (اللہ) کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کسی مسلمان کو کسی جرم میں قید کرنے کی نوبت نہیں آئی اور نہ ہی ریاستی سطح پر قید خانے موجود تھے۔ لہٰذا اس دور میں قیدیوں سے مراد صرف دشمن کے جنگی قیدی ہی ہو سکتے ہیں اور ان

۲۰۔ سورۂ محمد: ۴

۲۱۔ الدھر: ۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی قیدیوں کو کھانا کھلانا ممکن تھا۔ غزوۂ بدر کے کافر قیدیوں کو رسول اللہ ﷺ نے متعدد صحابہ کرام کی تحویل میں دیا اور انہیں ان قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم صادر فرمایا۔ چناں چہ صحابہ کرامؓ پہلے انہیں کھانا کھلاتے اور خود بعد میں کھاتے۔ اگر جنگی قیدیوں کو مسلمانوں میں غلاموں اور لونڈیوں کے طور پر تقسیم کیا گیا تو ان غلاموں اور لونڈیوں سے حسن سلوک کی اس قدر تاکید کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرضِ وفات میں جو آخری وصیت فرمائی وہ نماز کے قیام اور زیردست غلاموں اور لونڈیوں سے حسن سلوک کی تھی۔[۲۲] جنگی قیدیوں کے ساتھ مَنّ (احسان) کی دوسری صورت یہ ہے کہ انہیں اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری (ذمّی) قرار دیا جائے۔ چناں چہ ۷ ہجری میں فتح خیبر کے بعد خیبر کے علاقے کو اسلامی ریاست کا حصہ بنا کر اہلِ خیبر کو ذمی قرار دیا گیا اور ان سے جزیہ وصول کیا گیا۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں بھی مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو ذمی قرار دیا گیا۔ مَن (احسان) کی تیسری صورت یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔ چناں چہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے کسی کو بھی قیدی نہیں بنایا بل کہ اذھبوا وانتم الطلقاء (جاؤ، تم سب آزاد ہو) فرما کر سب کو بلا معاوضہ چھوڑ کر ان پر احسان عظیم فرمایا اور عفو و درگزر کی لازوال مثال قائم فرمائی۔[۲۳]

اسی طرح فدیہ کی ایک صورت یہ ہے کہ جنگی قیدیوں سے مالی معاوضہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ چناں چہ غزوۂ بدر کے اکثر قیدیوں کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا۔ فدیہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ جنگی قیدیوں سے کوئی خاص خدمت لے کر انہیں چھوڑا جائے۔ غزوۂ بدر کے جنگی قیدیوں میں سے جو قیدی رقم ادا نہیں کر سکتے تھے اور پڑھنا لکھنا جانتے تھے، ان کے ذمے یہ لگایا گیا کہ ہر قیدی دس دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔[۲۴] فدیہ کی تیسری صورت یہ ہے کہ اپنے جنگی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے دشمن کے جنگی قیدیوں سے ان کا باہم تبادلہ کیا جائے کہ دشمن سے اپنے قیدی چھڑانے کے لیے ان کے قیدی رہا کیے جائیں۔

ادھر غلام احمد پرویز نے مَن (احسان) کی صرف ایک صورت کو لیا کہ جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جائے اور سورہ محمد کی متعلقہ آیت کا مطلب یہ بیان کیا کہ جنگی قیدیوں کو یا تو بلا معاوضہ یا فدیہ لے

۲۲۔ ابن ماجہ: رقم ۱۶۲۵

۲۳۔ البدایۃ والنہایۃ: ج ۴، ص ۳۰۰۔۳۰۱، الاصابۃ: ترجمہ سہیلؓ بن عمرو

۲۴۔ طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۴۔ زرقانی: ج ۱، ص ۴۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر بہ ہر حال چھوڑنا ہوگا۔ انہیں غلام اور لونڈیاں نہیں بنایا جا سکتا۔ پرویز کا دعویٰ ہے کہ دور نبوی میں گھروں میں جو غلام اور لونڈیاں موجود تھے وہ اس آیت کے نزول سے پہلے کے تھے۔ اگر آیت کا یہ ہی مطلب ہوتو نزولِ آیت سے پہلے کے تمام غلاموں اور لونڈیوں کو بھی لازماً آزاد کر دیا جاتا، حال آں کہ ایسا نہیں ہوا۔

غلاموں اور لونڈیوں کے مسئلے کے حل کے لیے اس زمانے میں کوئی ایسا بین الاقوامی یا کم از کم جزیرۃ العرب میں ایسا کوئی بین القبائلی ادارہ نہیں تھا کہ کسی معاہدے کے تحت فریقین ایک دوسرے کے غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرنے کے پابند ہوتے۔ یک طرفہ طور پر ایسا فیصلہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ دشمن تو غلاموں اور لونڈیوں کو چھوڑنے اور آزاد کرنے پر تیار نہ ہو تو مسلمان یک طرفہ طور پر اس کے کیسے پابند ہو سکتے تھے کہ وہ دشمن کے جنگی قیدیوں کو ہر صورت میں رہا کر دیا کرتے۔ اس لیے اگر منّ (احسان) کا معنی صرف یہ ہی لیا جائے کہ جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ چھوڑ کر ان پر احسان کیا جائے تو اس کی حیثیت بہ ہر حال امر اباحت کی ہو سکتی ہے اسے ہر گز امرِ وجوبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چناں چہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو جنگی قیدیوں کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ غزوۂ بنی قریظہ کے یہودی جنگی قیدیوں کو قتل کیا گیا تھا۔ دور حاضر میں عالمی سطح پر اقوام عالم نے جنگی قیدیوں کو بالآخر رہا کرنے کا باہم معاہدہ کر رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے اور بعد کے ادوار میں بھی طویل عرصے تک ایسا کوئی عالمی ادارہ نہیں تھا لہٰذا غلاموں اور لونڈیوں کی رہائی کے مسئلے کا کوئی یک طرفہ حل بھی ممکن نہیں تھا، الا یہ کہ ان کے ساتھ حسن سلوک اختیار کیا جائے اور اس سلسلے میں مسلمانوں نے بڑی حد تک رسول اللہ ﷺ کے احکام کو شرحِ صدر سے قبول کیا اور کماحقہ ان پر عمل بھی کیا۔

مَن پسند مفہوم پر بے جا اصرار

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ اگر کسی قرآنی کلمے کے عربی لغت کے اعتبار سے متعدد معانی ہوں تو سیاق و سباق کا لحاظ کیے بغیر اپنی اغراضِ فاسدہ کے تحت اپنا من پسند مفہوم ہی لیا جائے اور قارئین کو دھوکہ دیا جائے۔ مثلاً لفظ "مُحصنات" کا ایک معنیٰ ہے "شادی شدہ خواتین"۔ چناں چہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے جہاں محرمات نسبیہ و رضاعیہ کا یعنی ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے مردوں کے لیے نکاح نسب اور رضاعت (خونی رشتے اور دودھ کے رشتے) کی بنا پر حرام ہے تو بعد میں مُحصنات (شادی شدہ عورتوں) کا بھی یوں ذکر فرمایا ہے والمحصنٰت من النساء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی جو خواتین شادی شدہ ہیں ان سے بھی نکاح حرام ہے۔[۲۵] کیوں کہ ایک خاتون کے دو خاوند نہیں ہو سکتے۔ لیکن سیاقِ کلام کے اعتبار سے مُحصنات کا لفظ "آزاد غیر شادی شدہ خواتین" کے معنی میں بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ مثلاً اسی سورۂ نسا میں ہے: وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ[۲۶] "اور تم میں سے جو شخص آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کی (مالی حیثیت سے) وسعت نہ پاتا ہو تو وہ مسلمان لونڈیوں سے جن کے تم مالک ہو، نکاح کر لے"۔ یہاں صاف ظاہر ہے کہ آیت میں "الْمُحْصَنٰتِ" سے غیر شادی شدہ خواتین ہی مراد ہو سکتی ہیں۔ پھر اسی آیت کے آخر میں ہے۔

فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ۔[۲۷] "تو جب یہ لونڈیاں قید نکاح میں آجائیں پھر اگر وہ بے حیائی کا ارتکاب کریں تو انہیں آدھی سزا ہے اس سزا سے جو "مُحْصَنٰتِ" (آزاد عورتوں) کے لیے ہے"۔ آیت کا سیاق و سباق ظاہر کر رہا ہے جس طرح آیت کے شروع میں "مُحْصَنٰتِ" سے مراد "آزاد غیر شادی شدہ عورتیں" ہیں تو آیت کے آخر میں بھی "مُحْصَنٰتِ" کا یہ ہی معنی ہے۔ یعنی آزاد غیر شادی شدہ عورت اگر زنا کرے تو اس کی سزا بالا تفاق سو کوڑے ہے تو شادی شدہ زانیہ لونڈی کی سزا اس کا نصف یعنی پچاس کوڑے ہے۔ لیکن منکرین حدیث وغیرہ آیت کے آخر میں "مُحْصَنٰتِ" کا (غلط) ترجمہ "شادی شدہ عورتیں" کر کے یہ (جھوٹا) استدلال کرتے ہیں کہ اگر شادی شدہ مرد اور عورت زنا کریں اور ان کی سزا رجم (سنگ سار کرنا) ہو تو رجم کا نصف کیسے ممکن ہے؟ لہٰذا بہ قول ان کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کی ایک ہی سزا یعنی سو کوڑے ہے۔ حال آں کہ آیت کا سیاق و سباق خوب واضح کر رہا ہے کہ آیت میں دونوں جگہ "الْمُحْصَنٰتِ" کا معنی 'غیر شادی شدہ خواتین' کا ہے جس سے روز روشن کی طرح یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ سورۂ نور میں زانی مرد اور زانی عورت کے لیے جو سو کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے تو یہ غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ہے۔ شادی شدہ زانی مرد و عورت کی سزا رجم اجماعِ امت اور سنت سے ایسے ہی ثابت ہے جیسے نمازوں کی رکعات کی تعداد اجماعِ امت اور سنت دونوں سے ثابت ہے۔ رجم کی سزا قرآن کریم میں مذکور نہیں تو

۲۵۔ النساء:۲۴

۲۶۔ النساء:۲۵

۲۷۔ النساء:۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد بھی تو قرآن کریم میں نہیں بیان کی گئی۔ شریعت کا ماخذ صرف قرآن ہی نہیں بل کہ سنت، اجماع اور قیاس بھی شریعت کے مآخذ و مصادر میں شامل ہیں۔

کلمات کے باہم تعلق کو نظر انداز کرنا

قرآن کریم میں معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ ہے کہ کلمات والفاظ کے باہم معنوی تعلق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر مُرتد کافر ہے لیکن ہر کافر کو مرتد نہیں کہا جاتا۔ کافر اور مرتد میں منطقی لحاظ سے عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ مرتد وہ کافر ہے جو پہلے مسلمان ہو پھر اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کر لے۔ قرآن کریم میں ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [۲۸] "دین میں کوئی زبردستی نہیں" یعنی کسی کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح کے قرآنی مضامین کا مرتدین سے دور دور کا بھی تعلق نہیں لیکن ان مضامین کی آڑ میں منکرینِ حدیث مسلمانوں کو ارتداد (مرتد ہونے) کی کھلی آزادی دیتے ہیں۔ حال آں کہ یہ امر طبقاتی تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے ارتداد اختیار کیا تو خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کرام کی متفقہ رائے سے ان کے خلاف قتال کیا۔ مرتدین یا تو مقتول ہوئے یا دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان سے جزیہ قبول نہیں کیا گیا۔ سورۂ فتح میں ہے تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ [۲۹] "تم ان سے قتال کرو گے یا وہ (ارتداد سے باز آکر دوبارہ) مسلمان ہوں گے" سورۂ مائدہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ [۳۰] "اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھرے گا تو (اس کی سرکوبی اور دین کی سربلندی کے لیے) اللہ عن قریب ایسے لوگ لے آئے گا جنہیں وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے۔ وہ مومنوں پر مہربان اور کافروں پر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا

۲۸۔ البقرہ: ۲۵۶

۲۹۔ الفتح: ۱۶

۳۰۔ المائدہ: ۵۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا (اور) بڑے علم والا ہے"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی مرتدین کو قتل کرنے کا حکم تھا۔ جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بچھڑے کی پوجا کی تھی تو اگرچہ انہوں نے بعد میں توبہ بھی کی لیکن ان کی توبہ کا قبول ہونا اس پر موقوف رکھا گیا کہ جنہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی وہ ان لوگوں کو جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی ہے اپنے ہاتھوں سے قتل کریں۔[۳۱] شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں البتہ مرتد اگر توبہ کر کے دوبارہ اسلام میں داخل ہو جائے تو قتل سے محفوظ رہے گا۔ مرتد پر سزا کا نفاذ اسلامی حکومت کی ذمے داری ہے۔ اس سلسلے میں اگر ناگزیر مواقع درپیش ہوں تو شرعی حکم عبوری طور پر معطل و موقوف تو رہے گا لیکن اسے سرے سے منسوخ یا کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

متعلقہ سیاق و سباق سے مجرمانہ چشم پوشی

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ قرآنی مضامین سے من پسند مگر غلط نتائج اخذ کرتے ہوئے متعلقہ قرآنی سیاق و سباق سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ مثلاً:

الف: سورۂ نساء میں میت کے ترکے میں وارثوں کے جو حصے بیان کیے گئے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر میت نے (تہائی مال تک کی) کوئی وصیت کی ہو یا میت پر کسی کا قرضہ ہو تو وصیت کی تکمیل اور قرضے کی ادائیگی کے بعد جو کچھ باقی بچتا ہو تو وہی ورثاء میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اس سے غلام احمد پرویز نے یہ مسئلہ کشید فرمایا ہے کہ ہر مسلمان پر اپنے مال کے متعلق وصیت فرض ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> سورۂ نساء میں پہلے اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصِينَ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٖ[۳۲]" یہ حصے میت کی وصیت اور قرضہ کے بعد ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے حصوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے چار مرتبہ یہی الفاظ دہرائے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اب آپ سوچ لیجیے بات کس قدر واضح ہے یعنی ہر مسلمان پر وصیت

۳۱۔ البقرہ: ۵۴

۳۲۔ النساء: ۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرض کی گئی ہے۔ اسے اپنی جائداد واموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے دے دے اور جتنا چاہے دے دے۔ [۳۳]

غور کیجیے کہ سورۂ نساء میں میت کی طرف سے کی گئی وصیت کی تکمیل کے ساتھ ورثا پر اس کے ذمے قرض کی ادائیگی کا حکم بھی تو ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب لینا درست ہوگا کہ ہر مرنے والے پر لازماً مقروض ہو کر مرنا فرض کیا گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ہر مرنے والے پر موت سے پہلے وصیت بھی فرض نہیں۔ یہ وصیت اس وقت فرض تھی جب ابھی ورثا کے حصے اللہ تعالیٰ نے متعین نہیں فرمائے تھے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کُتِبَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ الۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ [۳۴] "تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور وہ مال چھوڑ کر جاتا ہو تو وہ ماں باپ اور قرابت داروں کے لیے اچھائی کے ساتھ وصیت کر جائے۔ پرہیزگاروں پر (ایسا کرنا) ضروری ہے"۔ سورۂ نسا میں احکام میراث کے نزول کے بعد وصیت کا یہ حکم باقی نہ رہا، چناں چہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ان اللّٰہ قد اعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصية لوارث۔ [۳۵] یعنی "اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے (ورثا کے حصے مقرر کر دیے ہیں) اب کسی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں"۔ البتہ ایسے رشتہ داروں کے لیے جو وارث نہ ہوں یا کسی بھی نیک کام کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال تک کی وصیت کی جا سکتی ہے۔ [۳۶] پس سورۂ نساء کی متعلقہ آیات میں وصیت اور قرض کا جو یک جا ذکر کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو اپنے ترکہ کے متعلق ہر حال میں لازماً وصیت کر کے اور قرض اٹھا کر مرنا چاہیے، بل کہ مطلب یہ ہے کہ اگر مرنے والے نے اپنی زندگی میں جائز وصیت کی ہو یا وہ مقروض ہونے کی حالت میں فوت ہوا ہو تو وصیت کی تکمیل اور قرض کی ادائیگی کے بعد اس کا باقی ماندہ ترکہ ورثا میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

۳۳۔ قرآنی فیصلے: ص ۱۰۹

۳۴۔ البقرہ: ۱۸۰

۳۵۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۵۲۱، رقم ۵۰۶۵ عن ابی امامۃ

۳۶۔ بخاری: کتاب الفرائض، باب میراث البنات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ب: سورۂ نوح میں قوم نوحؑ کے متعلق ہے اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا [۳۷] اس کا ترجمہ خود محمد اسلم جیراجپوری نے یہ کیا ہے "وہ (قوم نوح والے) غرق کیے گئے پھر آگ میں داخل کیے گئے"۔ قرآنی کلمات کا سیاق وسباق ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم کو غرق ہونے کے بعد عالم برزخ میں آگ کے عذاب کا سامنا ہے۔ چوں کہ جیراجپوری عذاب قبر کے منکر ہیں لہٰذا وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

> قیامت، جنت، دوزخ وغیرہ کے لیے قرآن میں جا بہ جا ماضی کے صیغے استعمال ہوئے حال آں کہ یہ سب یوم قیامت کو مستقبل میں ہوگا۔ اس لیے قوم نوح کے متعلق جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں یہ قیامت کے دن کے لیے ہیں۔ [۳۸]

غور کیجیے آیت کے متعلقہ حصے میں اُغْرِقُوْا اور اُدْخِلُوْا کو مستقبل کا معنی پہنایا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا "وہ غرق کیے گئے پھر آگ میں داخل کیے جائیں گے"۔ اس ترجمہ کا مہمل ہونا بالکل واضح ہے پس لامحالہ دونوں الفاظ کا ترجمہ ماضی کے صیغوں میں کیا جائے گا جس سے عذاب قبر بہ خوبی ثابت ہو رہا ہے۔

سورۂ مومن میں ہے: وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ [۳۹] "اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا جس پر وہ صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرمان ہوگا کہ) فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالو"۔ ان آیات سے عذاب قبر کا بڑا واضح ثبوت ملتا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب تم میں سے کوئی مرتا ہے تو (قبر میں) اس پر صبح وشام اس کی جگہ پیش کی جاتی ہے یعنی اگر وہ جنتی ہے تو جنت اور اگر وہ جہنمی ہے تو جہنم اس پر پیش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تیری اصل جگہ ہے جہاں قیامت کے دن اللہ تجھے بھیجے گا"۔ [۴۰] مذکورہ قرآنی آیات میں آل فرعون کی صبح وشام آگ پر پیشی سے بالکل واضح ہے کہ یہ قیامت سے پہلے کا حال ہے اور قیامت سے پہلے برزخ اور قبر ہی کی زندگی ہے۔ قیامت کے دن انہیں قبر سے نکال کر سخت ترین

۳۷۔ سورہ نوح: ۲۵

۳۸۔ (الف) قرآنی فیصلے: ص ۳۲۱

۳۹۔ سورۃ المومن: ۴۵۔۴۶

۴۰۔ صحیح بخاری: باب المیت یعرض علیہ مقعدہ بالغداۃ والعشی۔ مسلم: کتاب الجنۃ۔ باب عرض مقعد الجنۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عذاب یعنی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ آیت میں کلمات وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ واوٗ مغائرت (ایک الگ مضمون کو بیان کرنے) کے لیے ہے۔ یعنی قیامت کے دن سے شروع ہونے والا عذاب الگ ہے اور اس سے پہلے برزخی مدت کا عذاب الگ ہے جس کا ذکر آیت میں پہلے کیا گیا ہے اور اسی سورۂ مومن میں ہے: ومن وراء هم برزخ الى يوم يبعثون [۴۱]" اور ان (مرنے والوں) کے لیے پس پشت اس دن تک کے لیے ایک حجاب ہے جب وہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے" لیکن منکر حدیث محمد اسلم جیراجپوری نے لکھا ہے:

> یہ مفہوم ان تمام قرآنی آیات کے خلاف ہے جو پہلے بہ دلائل بیان کر دی گئی ہیں کیوں کہ برزخ میں آل فرعون روزانہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں تو ان میں زندگی اور آگ کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور و احساس بھی ہونا چاہیے جس کا قرآن تصریحاً انکاری ہے اور قرآنی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ [۴۲]

جیراجپوری صاحب نے يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ آل فرعون کو قیامت کے دن سے صبح و شام آگ پر پیش کیا جائے گا۔ حال آں کہ آیت کے سیاق و سباق سے اس کی مکمل نفی ہو رہی ہے اگر یہاں صرف اُخروی عذاب ہی مراد ہوتا تو آیت میں ابتدا ہی سے اس کا ذکر ہوتا اور بعد میں "واوٗ مغائرت" لانے کے بعد وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ کے کلمات الگ نہ لائے جاتے۔ قرآنی مضامین میں قطعاً کوئی حقیقی اختلاف نہیں البتہ انکارِ حدیث کی وجہ سے جیراجپوری صاحب قرآن فہمی کی نعمت سے محروم اور پرلے درجے کی کج فہمی کا شکار ہیں۔ یہاں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں:

۱۔ نیند کو موت کی بہن کہا جاتا ہے جس طرح بہ حالتِ خواب پوری زندگی نہیں ہوتی اسی طرح بحالت برزخ بھی پوری موت نہیں ہوتی چناں چہ لسانی محاورات میں نیند کو موت اور نیند سے بیداری کو زندگی کہہ دیا جاتا ہے۔ نیند سے بیداری کے بعد کی مشہور مسنون دعا یہ ہے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔ [۴۳]" اللہ کے لیے ہی سب تعریف ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد

۴۱۔ المومن: ۱۰۰

۴۲۔ قرآنی فیصلے: ص ۳۲۶

۴۳۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۵۰۲، رقم ۹۳۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوبارہ زندہ کیا (یعنی نیند سے بیداری عطا فرمائی) اور اسی طرف (بہ روز قیامت بھی) اٹھ کر جانا ہے"۔
جس طرح نیند کی حالت میں روح جسم سمیت راحت و رنج سے دوچار ہو سکتی ہے اسی طرح بہ حالتِ برزخ بھی روح جسم سمیت راحت و رنج سے دوچار ہو سکتی ہے۔ جس طرح نیند سے بیدار ہونے پر جاگنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کتنا عرصہ سویا رہا، بل کہ خارجی قرائن گھڑی وغیرہ سے، سورج چاند اور ستاروں کے ذریعے وقت کی پہچان سے یا کسی کے بتانے سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح قبر سے اٹھنے والوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کتنا عرصہ قبر میں پڑے رہے۔ اصحاب کہف غار میں تین سو سال تک نیند کی حالت میں پڑے رہے۔ جاگنے پر انہیں یہ خیال ہوا کہ وہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ وہاں پڑے رہے ہیں۔ کبھی مدت معلوم ہو جانے کے باوجود نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لمبی مدت بھی بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نوے سالہ بوڑھے سے پوچھیے تو وہ اپنی گذشتہ زندگی کے متعلق یہ کہے گا کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کل کی باتیں ہیں وغیرہ۔

۲۔ قبر میں مُردوں کے سننے کی نفی کہیں سے ثابت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اور اپنی طرف سے جب چاہیں اور جو چاہیں مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔ یعنی نفی سماع (سننے) کی نہیں بل کہ اسماع (سنانے) کی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ جن مُردوں کو کچھ سنانا چاہیے تو وہ اس پر قادر ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۔ (۴۴) "بے شک اللہ جسے چاہتا ہے سنا دیتا ہے لیکن (اے پیغمبر!) تم قبروں میں مدفون لوگوں کو (اپنی مرضی اور اختیار سے) نہیں سنا سکتے"۔

۳۔ زندگی اور موت کا باہم تعلق نسبتی اور اضافی (Relative) ہے۔ موت عدم محض کا نام نہیں ہے۔ چناں چہ شعور و احساس کے لیے بھرپور حیوانی زندگی کا ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ قرآن کریم سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ جمادات تک میں بھی ایک حد تک شعور و احساس موجود ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۔ (۴۵) یعنی "کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو (اپنے طور پر) نہیں سمجھ سکتے" سورۂ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ

۴۴۔ فاطر: ۲۲

۴۵۔ بنی اسرائیل: ۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ (۴۶)" بے شک ہم نے پہاڑوں کو اس (داؤد) کے تابع کر رکھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شام کو اور صبح کو (اللہ کی) تسبیح کریں"۔ اب اگر جمادات کی تسبیح خوانی سے مراد صرف یہ ہو کہ یہ سب قوانین فطرت کے تابع ہیں تو اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کی تسبیح خوانی کے ذکر کے فائدہ ہی کیا ہوا؟ جب سبھی پہاڑ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ قوانین فطرت کے تابع ہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرنے والے پہاڑوں کی تخصیص بے مقصد اور بلا جواز ٹھہرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ پس لامحالہ یہ پہاڑ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی تسبیح و تحمید میں یوں شریک ہوتے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی ان کی تسبیح و تحمید کا پورا پورا ادراک تھا۔ بعض پتھروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان منها لما يهبط من خشية الله (۴۷)" اور بعض پتھر اللہ تعالیٰ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں" مسجد نبوی میں جس تنے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، جب لکڑی کا منبر بن گیا اور اس تنے کو آپ نے چھوڑ دیا تو بچے کی طرح اس سے رونے کی آواز آتی تھی۔ (۴۸) بعض صحابہؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ انہوں نے کھانے سے تسبیح کی آواز سنی۔ (۴۹) مکہ مکرمہ میں ایک پتھر تھا جو رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا کرتا تھا (۵۰) یہ احادیث ہم نے اس لیے بیان کر دی ہیں کہ ان سے متعلقہ قرآنی مضامین کی بھرپور تائید ہو رہی ہے۔ الغرض جب بے جان جمادات میں بھی ایک مخصوص قسم کا شعور ہے جسے گو ہم سمجھ نہ سکیں تو مُردے کے جسم میں ایسا شعور و احساس کیوں نہیں ہو سکتا جس سے اسے عالم برزخ میں راحت و رنج کا احساس ہو سکے؟ مردے کے اسی احساس و شعور کو دینی اصطلاح میں اس کی برزخی زندگی کہا جاتا ہے۔ یہ برزخی زندگی ہر مرنے والے انسان کو حاصل ہے لیکن شہداء اور انبیا علیہم السلام کی برزخی زندگی اعلیٰ درجے کی ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اسے برزخی زندگی اور اُخری زندگی کہا جاتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے دینوی زندگی (موت سے پہلے کی زندگی) کو دو حصوں حالت

۴۶۔ ص:۱۸

۴۷۔ البقرہ:۷۴

۴۸۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۳۷۲، رقم ۹۴۷۷_۸۴۷۸ عن جابرؓ

۴۹۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۳۷۶، رقم ۸۴۹۴ عن ابن مسعودؓ

۵۰۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۳۷۲، رقم ۸۴۷۳ عن جابر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیداری والی زندگی اور حالت نیند والی زندگی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس طرح حالت نیند والی زندگی کو حالت بیداری والی زندگی کے مقابلے میں "موت" کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح موت کے بعد والی عام مُردوں کی برزخی زندگی کو ان کی اُخروی زندگی کے مقابلے میں "موت" اور اس برزخی زندگی والوں کو "مردے" کہا جاتا ہے۔ جس طرح دینوی زندگی میں بہ حالت خواب انسانی شعور واحساس کم زور تو ہو جاتا ہے لیکن معدوم نہیں ہوتا، بعینہ اسی طرح برزخی زندگی والے مُردوں کا احساس وشعور اُخروی زندگی کے مقابلے میں گو کم تر درجے کا ہو لیکن یہ کلیتاً معدوم نہیں ہوتا۔

۴۔ جس طرح اُخروی زندگی میں اہل جنت کے مدارج و مراتب یکساں نہیں بل کہ ان میں فرق اور تفاوت ہے اسی طرح اہل جہنم کی جہنمی زندگی بھی یکساں نہیں بل کہ وہاں بھی عذاب میں کمی بیشی ہے قرآن کریم میں ہے لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ۔ [51] "اس (جہنم) کے سات دروازے ہیں۔ ہر ایک دروازے کے لیے ان (جہنمیوں) میں سے جماعتیں تقسیم کر دی گئی ہیں"۔ سورۂ نسا میں ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ [52] "بے شک منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے"۔ پس جن جہنمیوں کے برزخی عذاب کی مدت طویل ہو تو عین ممکن ہے کہ اسی تناسب سے اُخروی زندگی میں ان کے لیے جہنم کا عذاب کچھ کم ہو لہٰذا عذاب قبر کے منکرین کا یہ اعتراض لغو ہے کہ عذاب کو تسلیم کرنے سے مثلاً قوم نوح کے برزخی لوگوں کا عذاب قوم فرعون کے برزخی لوگوں سے بہت طویل ہوگا اور یہ ظلم ہے۔ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ جہنمیوں کو عذاب سب کے لیے یکساں نہیں ہوگا اس لیے لمبی مدت کے برزخی عذاب والوں کا اُخروی عذاب اسی تناسب سے کم ہو سکتا ہے۔

۵۔ یہاں دل چسپ صورت حال یہ ہے کہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری تو برزخی زندگی کے منکر ہیں لیکن ان کے شاگرد غلام احمد پرویز نے ان کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۵۱۔ الحجر:۴۴

۵۲۔ النساء:۱۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب جسمانی نظام طبعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔[۵۳]

پرویز صاحب کی اس تحریر سے مرنے کے بعد نفس یا روح کی زندگی ثابت ہو گئی تو احساس و شعور اور رنج و راحت سب کچھ از خود ثابت ہو گیا۔ اب اختلاف صرف اس امر میں باقی رہا کہ یہ برزخی راحت والم مرنے والے کی صرف روح کو ہوتا ہے یا اس کا جسم بھی اس کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ تو جمہور اہل علم کی رائے یہ ہی ہے کہ مرنے والے کے جسم میں خواہ کتنے ہی تغیرات واقع ہوں تو بھی روح کے ساتھ اس کا اس طرح کا ایک تعلق باقی رہتا ہے جس سے ثواب و عذاب جسم اور روح دونوں کو ہی محسوس ہو۔ اسی کو قبر کا ثواب و عذاب کہا جاتا ہے۔ اور ہم اوپر یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ احساس و شعور کے لیے بھر پور حیوانی زندگی کا ہونا ویسے بھی ضروری نہیں۔ احساس و شعور جب کسی نہ کسی حد تک جمادات تک میں بھی موجود ہے تو مرنے والے کے جسم کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کی کوئی قطعی دلیل ہرگز موجود نہیں کہ قرآن و سنت سے ثابت برزخی راحت والم کا انکار کر دیا جائے۔ اور دور از کار تاویلاتِ فاسدہ کا سہارا لیا جائے۔

بے خبری کے عالم میں خود فریبی

قرآن کریم میں معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ قرآنی آیات کے مسلمہ صحیح مفاہیم و معانی پر ناحق اعتراض کرتے ہوئے جو خود ساختہ اور جعلی مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس پر بھی وہی بل کہ اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین اعتراضات و اشکالات وارد ہوتے ہیں لیکن انکار حدیث اور قرآن سے محبت کے پردے میں قرآن دشمنی کی نحوست سے منکرین حدیث کی عقل ایسی ماؤف ہوتی ہے کہ وہ سمجھ نہیں پاتے اور خود فریبی کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً:

الف: سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت مبارکہ کا حال بیان کیا گیا ہے جس کی خود ساختہ اور من گھڑت تشریح مسٹر غلام احمد پرویز نے اپنے نام نہاد درس قرآن میں کی ہے۔[۵۴] سورۂ مریم

۵۳۔ قرآنی فیصلے: ص ۳۴۷

۵۴۔ غلام احمد پرویز۔ مطالب القرآن فی دروس الفرقان: ص ۲۴۹۔۲۸۹ ملخصاً۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرک۔ ۲، لاہور۔ اشاعت اول مئی ۲۰۰۴ عیسوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہے کہ جب وہ (مریم اللہ کی عبادت یا اپنی کسی ضرورت کے لیے) لوگوں سے علیحدہ ایک مقام پر گئیں۔ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا o قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا o قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ڰ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا o قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا o قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا[55] "تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح (جبرئیلؑ) کو بھیجا پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ (مریم نے) کہا، میں تجھ سے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (اللہ سے) ڈرنے والا ہے (تو یہاں سے چلا جا)۔ اس (جبرئیلؑ) نے جواب دیا کہ میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ (اللہ کی طرف سے) تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ وہ کہنے لگیں بھلا میرے بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور نہ ہی میں بدکار ہوں۔ (جبرئیلؑ نے) کہا، بات تو یہ ہی ہے لیکن تیرے رب کا ارشاد ہے کہ یہ کام تو مجھ پر بہت آسان ہے اور تاکہ ہم اس (بچے) کو لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کاملہ کی) خاص نشانی بنا دیں اور یہ کام تو (تقدیر الٰہی میں) طے شدہ ہے"۔ چوں کہ فرشتہ جبرئیلؑ کے انسانی شکل و صورت میں حضرت مریمؑ کے پاس آنے اور حضرت مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا معجزانہ تصور غلام احمد پرویز کے لیے سوہانِ روح تھا اور اس سے وہ ہر صورت میں نجات چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے متعلقہ آیات کا خود ساختہ مطلب یہ بیان کیا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا قاصد حضرت مریمؑ کے پاس یہ بشارت لے کر آیا تھا کہ تم راہبانہ زندگی سے الگ ہو کر شادی کرو گی اور اس سے تمھارے ہاں لڑکا پیدا ہو گا۔ پرویز کا یہ کہنا ہے کہ اگر حضرت مریم کے پاس آنے والا شخص فرشتہ جبرئیل ہوتا تو حضرت مریم اس سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ کیوں مانگتیں؟ اگر اس تاویل کو قبول کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریا نے حضرت مریم کے پاس جو انسانی قاصد بھیجا تھا کیا وہ کوئی بدمعاش و بدکار شخص تھا یا صالح و پرہیزگار تھا؟ اگر وہ بدمعاش و بدکار تھا تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضرت زکریا نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ایک بدکار شخص کو حضرت مریم کے پاس خلوت میں بھیجا تھا۔ اگر یہ قاصد کوئی صالح و پرہیزگار شخص تھا تو حضرت مریم نے اس سے بچنے کے لیے اللہ سے پناہ کیوں مانگی تھی؟ اگر یہاں یہ کہیں کہ حضرت مریمؑ اس قاصد کو پہچانتی نہیں تھیں اور نہ ہی انہیں یہ معلوم تھا کہ یہ قاصد حضرت زکریا کا بھیجا ہوا ہے تو

۵۵۔ سورہ مریم: ۱۷۔۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعینہ یہ ہی بات حضرت جبرئیل کے متعلق کیوں نہیں کہی جا سکتی کہ حضرت مریمؑ کو علم نہیں تھا کہ یہ جبرئیلؑ ہیں جو اللہ کے حکم سے انسانی صورت میں ان کے پاس آئے ہیں۔

جبرئیلؑ کا حضرت مریمؑ سے مکالمہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے ہوگی، جیسا کہ دیگر قرائن وشواہد کے علاوہ کلمات وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ (اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے خاص نشانی بنائیں سے بھی ظاہر ہے اور ان سب متعلقہ آیات کے آخر میں ہے ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ۔[۵۶] "یہ ہے صحیح واقعہ عیسیٰ بن مریم کا، یہ ہی وہ حق بات ہے جس میں لوگ شک وشبہ میں مبتلا ہیں"۔ لیکن پرویز کا اصرار ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے تھے بل کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یوسف نجار ان کا باپ تھا۔ پرویز کا استدلال یہ ہے کہ اناجیل متی ولوقا میں حضرت عیسیٰ کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے اس میں یوسف نجار کو ان کا باپ ظاہر کیا گیا ہے۔ خوب غور کیجیے یہاں قرآن دشمنی میں پرویز صاحب محرف اناجیل کی طرف بھاگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب احادیث صحیحہ تو ان کے خیال میں عجمی سازش کے تحت گھڑی ہوئی اور ناقابل اعتماد ہیں لیکن اناجیل ان کے یہاں نہایت معتبر اور مستند ہیں ساء ما یحکمون۔ پرویز کو قرآن میں یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ حضرت عیسیٰؑ کو ان کی والدہ ماجدہ مریمؑ کا بیٹا کوئی ۲۳ مرتبہ کہا گیا ہے۔ کہیں بھی انہیں عیسیٰ بن یوسف نہیں کہا گیا۔ پرویز کو قرآن میں اللہ کا یہ حکم بھی نظر نہیں آیا اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ[۵۷] "تم انہیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کرکے بلاؤ، اللہ کے نزدیک پورا انصاف یہ ہی ہے"۔ یعنی اللہ مسلمانوں کو تو یہ حکم دیتا ہے کہ لوگوں کا نسب باپ کی طرف لوٹاؤ لیکن وہ خود کوئی ۲۳ مرتبہ حضرت عیسیٰ کا نسب ان کی ماں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ خوبی واضح نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ تھا ہی نہیں۔ پرویز کو قرآن میں یہ بھی نظر نہیں آیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے سوا کسی اور پیغمبر کا ذکر نہ باپ کے نام کے ساتھ اور نہ ہی ماں کے نام کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کو بار بار "عیسیٰ ابن مریم" کہا جا رہا ہے تاکہ خوب واضح ہو جائے کہ ان کا کوئی باپ نہیں تھا اور وہ اپنی ماں کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ پرویز کو

۵۶۔ مریم: ۳۴

۵۷۔ الاحزاب: ۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن میں یہ بھی تو نظر نہیں آیا کہ حضرت عیسیٰ نے لوگوں سے یہ بھی کہا تھا وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ز وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (۵۸)" اور (اللہ نے مجھے) اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں کیا"۔ اگر حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ ہوتا تو آپ صرف والدہ کی بات نہ کرتے بل کہ والدین کا ذکر ہوتا۔ پرویز کو سورۂ آل عمران کی یہ آیت بھی نظر نہیں آئی اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۵۹)" بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کہا، ہو جا تو وہ ہو گیا"۔ یعنی حضرت آدمؑ ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اور عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اگر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے حضرت آدمؑ عیسائیوں کے نزدیک خدا یا خدا کے بیٹے نہیں بل کہ الٹا وہ انہیں گناہ گار سمجھتے ہیں تو حضرت عیسیٰؑ اگر باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو عیسائیوں نے انہیں خدا اور خدا کا بیٹا کیوں قرار دے ڈالا ہے؟

پرویز نے انجیل متی کا حوالہ دیا تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ انجیل متی میں مذکور نسب نامہ اوپر سے نیچے کی جانب کو ہے اور اس کے آخر میں یہ کہا گیا ہے " اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا۔ یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے"۔ (۶۰) یعنی انجیل متی کے مولف متیٰ نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ "یوسف سے یسوع پیدا ہوا"۔

> چناں چہ اس کے بعد متی نے لکھا ہے: اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قوت سے حاملہ پائی گئی O پس اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور وہ اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا O وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف بن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیوں کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ

۵۸۔ مریم: ۳۲

۵۹۔ آل عمران: ۵۹

۶۰۔ انجیل متی۔ ۱:۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روح القدس کی قدرت سے ہے O اس کے بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا کیوں کہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا O یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ O دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی O[۶۱]

انجیل متی کے اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ انجیل متی کا مؤلف ہرگز اس کا قائل نہیں کہ یسوع (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کا باپ یوسف نجار تھا بل کہ وہ اس کا بھرپور اعتراف کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کنواری مریم کے پیٹ سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن غلام احمد پرویز نے اس سے آنکھیں بند کرلیں۔ اسی طرح انجیل لوقا میں ہے:

چھٹے مہینے میں جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا O جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا O اور فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا، سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے خداوند تیرے ساتھ ہے O وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا سلام ہے O فرشتہ نے اس سے کہا، اے مریم! خوف نہ کر کیوں کہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے O اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا اس کا نام یسوع رکھنا O وہ بزرگ ہوگا اور خداوند تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اسے دے گا اور وہ یعقوب کے گھرانے پر تا ابد بادشاہت کرے گا اور اس کی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا O مریم نے فرشتے سے کہا یہ کیوں کر ہوگا جب کہ میں مرد کو نہیں جانتی؟ O اور فرشتے نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی اور اس سبب سے وہ مولود مقدس خدا کا بیٹا کہلائے گا O"۔[۶۲]

انجیل لوقا کے مذکورہ اقتباس سے بھی واضح ہے کہ اس انجیل کا مؤلف لوقا بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے کا بھرپور قائل ہے۔ پھر اسی انجیل لوقا میں ہے

۶۱۔ متی۔ ۱۸:۱

۶۲۔ انجیل لوقا۔ ۱:۲۶۔۳۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت اللحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے اس لیے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھاO تاکہ اپنی منگیتر مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائےO (۶۳)

غور کیجیے یہاں لوقا نے حاملہ مریمؑ کو یوسف نجار کی بیوی نہیں بل کہ منگیتر لکھا ہے یعنی لوقا کے نزدیک ابھی حضرت مریمؑ کا یوسف سے نکاح ہی نہیں ہوا تھا صرف منگنی ہوئی تھی کہ حضرت مریمؑ روح القدس کی قوت سے حاملہ تھیں۔ متی اور لوقا دونوں ہی نے یہ لکھا ہے کہ مریم اور یوسف کے اکٹھا ہونے سے پہلے ہی مریمؑ کے بطن سے عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھرپور طریقے سے واضح کر رہے ہیں۔ چوں کہ نسب باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کا کوئی باپ ہے ہی نہیں تو متی اور لوقا نے محض رواجاً آپ کا نسب یوسف کی طرف اس طرح منسوب کیا کہ متی نے متعلقہ جملہ یوں کر دیا " اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے"۔

غور کیجیے متی نے یسوع (حضرت عیسیٰؑ) کی پیدائش کو ان کی والدہ حضرت مریم سے منسوب کیا اور ہرگز یوسف کی طرف منسوب نہیں کیا، ورنہ اوپر سے چلے آ رہے سیاق کلام کے تحت متی یوں لکھتا " اور یوسف سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے"۔ لوقا نے نسب نامہ شروع کرتے وقت لکھا " جب یسوع خود تعلیم دینے لگا قریباً تیس برس کا تھا اور (جیسا کہ سمجھا جاتا تھا) یوسف کا بیٹا تھا"۔ (۶۴) یہاں بھی غور کیجیے کہ اس سے پہلے لوقا اپنی انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہونا تسلیم کر چکا ہے تبھی تو اسے یہاں بین القوسین "جیسا کہ سمجھا جاتا تھا" کا جملہ بڑھانا پڑا۔ یعنی اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، لیکن چوں کہ بہ مطابق اناجیل یوسف، حضرت مریم کا شوہر تھا اس لیے لوگ یوسف کو حضرت عیسیٰؑ کا محض رواجاً باپ سمجھتے تھے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے سورۂ احزاب کے نزول سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو لوگ زید بن محمد (رواج کے مطابق) کہا کرتے تھے۔

الغرض غلام احمد پرویز نے موجودہ اناجیل کے متعلق مذکورہ حقائق سے آنکھیں بند کر کے لوگوں کو خوب خوب دھوکہ دیتے ہوئے انجیل متی اور انجیل لوقا میں مذکور نسب ناموں کے حوالے سے حضرت

۶۳۔ لوقا۔ ۲:۴۔۵

۶۴۔ لوقا۔ ۳:۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عیسیٰ علیہ السلام کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یوسف نجار کا بیٹا بنا دیا۔ جناب پرویز نے اس سے بھی اپنی آنکھیں پوری طرح بند کرلیں کہ اناجیل کے ان نسب ناموں میں زبردست تضاد ہے جسے کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ نیز ان نسب ناموں کو صحیح تسلیم کرنے سے حضرت عیسیٰ کو سچا مسیح ثابت کرنا ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہ مطابق انجیل لوقا فرشتہ جبرئیل نے سچے مسیح کی یہ نشانی بتائی تھی ''اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اسے دے گا...''[۶۵] اب دیکھیے انجیل متی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نسب یکونیاہ سے ملایا گیا ہے۔[۶۶] جو تواریخ دوم کی رو سے یہویقیم کا بیٹا ہے۔[۶۷] اس یہویقیم کے متعلق حضرت یرمیاہ پر وحی نازل ہوئی تھی کہ یہویقیم کی نسل سے کوئی بھی تخت داؤدی کا ہرگز وارث نہیں ہوگا۔[۶۸] جب انجیل متی میں مذکور نسب نامے کی رو سے حضرت عیسیٰ اسی یہویقیم کے بیٹے یکویاہ کی نسل سے ہیں تو آپ تخت داؤد کے وارث نہ ہوئے لہٰذا بہ مطابق بائبل آپ (معاذ اللہ) سچے مسیح بھی ثابت نہ ہوئے۔ اب دیکھیے کہ ان نسب ناموں کو تو مسٹر پرویز نے آسمانی وحی قرار دے کر تسلیم کرلیا اور حضرت عیسیٰ کو (معاذ اللہ) یوسف نجار کا بیٹا قرار دے ڈالا لیکن ان ہی اناجیل کے اس کھلے مضمون سے پوری طرح آنکھیں بند کرلیں کہ آپ بغیر باپ کے کنواری مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے حال آں کہ یہ مضمون قرآن کریم کے متعلقہ مضامین کے عین مطابق ہے۔ چناں چہ صرف مسلمان ہی نہیں بل کہ عیسائی بھی حضرت عیسیٰؑ (یسوع مسیحؑ) کو حضرت مریمؑ کے بطن سے بن باپ پیدا ہونے والا مانتے ہیں۔ کیا یہ مسٹر پرویز کی قرآن کریم سے کھلی دشمنی کا نہایت بین ثبوت نہیں؟ سورۂ حج میں ہے: فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ[۶۹] ''تو بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بل کہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں میں ہیں''۔ سورۂ فُصّلت میں ہے کہ ''جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بھلا جو شخص (اپنی ان حرکات کی وجہ سے) آگ میں ڈالا جائے وہ

۶۵۔ لوقا۔۱:۳۲۔۳۳

۶۶۔ انجیل متی۔۱:۱۰

۶۷۔ بائبل: تواریخ دوم۔۳۶:۵۔۹

۶۸۔ بائبل۔ یرمیاہ ۳۶:۳۰

۶۹۔ الحج:۴۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن وامان سے (ہمارے پاس) آئے۔ (تو خیر) جو چاہو سو کرتے چلے جاؤ، بے شک وہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھ رہا ہے"۔ (۷۰)

اسی سورۂ مریم میں ہے کہ وضع حمل کے وقت دردِ زہ حضرت مریمؑ کو باہر ایک کھجور کے تنے کے نیچے لے آیا تو وہ کہنے لگیں کہ کاش میں اس سے پہلے ہی مر مٹ گئی ہوتی۔ اس پر (حضرت جبرئیلؑ کی) آواز نیچے سے انہیں سنائی دی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تیرے رب نے تیرے پاؤں تلے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے اور تو کھجور کے اس تنے کو ہلا تو یہ تیرے سامنے تر و تازہ کھجوریں گرا دے گا۔ پس تو اطمینان سے کھا پی اور (بچے کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی رکھ "(۷۱) "تو اگر تجھے کوئی انسان دکھائی دے تو اسے (اشارے سے) کہہ دینا کہ میں نے رحمن کے لیے روزہ مان رکھا ہے اس لیے میں آج کسی انسان سے کوئی بات نہیں کروں گی"۔ ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ اس وقت حضرت مریمؑ کے پاس کوئی انسان موجود ہی نہیں تھا اور انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر کوئی انسان دکھائی دے تو (اشارے سے) اسے بتا دینا کہ میں نے اللہ کے لیے روزہ مان رکھا ہے اس لیے میں آج کسی انسان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ لیکن غلام احمد پرویز نے ان قرآنی آیات کا مذاق اڑاتے ہوئے حضرت مریمؑ کا انسانوں سے مکالمہ کرا ہی دیا۔ چناں چہ ان کا کہنا ہے کہ حضرت مریمؑ سے مذکورہ مکالمہ فرشتہ جبرئیل سے نہیں ہوا تھا بل کہ جس باغ میں وہ اس وقت مقیم تھیں وہ ایک یہودی کا تھا۔ باغ کے یہودی مالک کو حضرت مریمؑ کے (مبّینہ) شوہر یوسف نجار نے ساری صورت حال بتائی تو اس نے دور ہی سے حضرت مریمؑ سے مذکورہ ساری گفت گو کی تھی۔ اس انتہائی لچر، لغو اور بے ہودہ پرویزی تاویل کو قبول کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یوسف نجار شاید خود گونگا تھا۔ وہ تو اپنی (مبّینہ) بیوی سے محو گفت گو نہ ہوا، اس لیے ایک غیر محرم یہودی کو بات کرنی پڑی اور شاید اس یوسف کے پاؤں کو مہندی لگی ہوئی تھی کہ وہ خود اپنی مبّینہ بیوی کے پاس جانے اور کھجور کے تنے کو ہلا کر کھجوریں گرانے سے معذور تھا۔ نیز یہ یہودی مالک حضرت مریمؑ کو یہ جو مشورہ دے رہا تھا کہ جو انسان بھی تجھے دکھائی دے تو اس سے کہہ دینا کہ میں نے اللہ کے لیے روزہ مان رکھا ہے اس لیے میں آج کسی انسان سے بات نہیں کروں گی تو کیا یہ یہودی خود انسان نہیں بل کہ کوئی جن یا فرشتہ تھا؟ اگر وہ حضرت مریمؑ سے نہایت شرح صدر سے مفصل مکالمہ کرنے کا مجاز تھا تو دوسرے کسی انسان کے

۷۰۔ فصلت: ۴۰

۷۱۔ مریم: ۲۲۔۲۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے حضرت مریمؑ سے محو گفت گو ہونا کیوں ممنوع تھا؟ نیز جب بہ قول پرویز یوسف نجار ان تمام مراحل میں حضرت مریمؑ کے ساتھ تھا تو کسی کو حضرت مریمؑ کے اس (مبینہ) شوہر سے گفت گو کی بہ جائے ایک خاتون سے ہی ہم کلام ہونے کی کیا مجبوری لاحق ہو سکتی تھی؟ اسی سورہ مریمؑ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو حضرت مریمؑ انہیں اٹھائے ہوئے اپنی قوم میں آئیں چناں چہ ارشاد ہے: فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا[۷۲] ” تو وہ (مریم) اس (عیسیٰؑ) کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی تو وہ کہنے لگے کہ اے مریم! تو نے بڑی بری حرکت کی۔ اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی۔ تو اس (مریم نے چپ کا روزہ رکھنے کی وجہ سے) اس (بچے) کی طرف اشارہ کر دیا تو وہ کہنے لگے کہ بھلا ہم گود کے بچے سے کیا بات کریں گے؟ (بچہ) بول اٹھا: بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا ہے۔ اور اس نے مجھے برکت والا بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں۔ اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا تاکیدی حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے اور اس نے مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے“۔ یہاں غلام پرویز کا دعویٰ یہ ہے کہ جب حضرت مریمؑ اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو اپنی قوم کے پاس لائی تھیں تو حضرت مریمؑ کا مبینہ شوہر یوسف نجار بھی ساتھ تھا اور اس وقت حضرت عیسیٰؑ کی عمر کوئی تیس برس کی تھی۔ جب قوم کے طعن و تشنیع پر حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا تو قوم کے ان معمر مگر متکبر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ تیرا یہ (تیس سالہ) بیٹا تو ہمارے لیے گود میں پلنے والے کل کے بچے کی طرح ہے۔ پرویز کا استدلال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے اس لیے اس وقت تک آپ کو کتاب اور نبوت مل چکی تھی۔ یہاں بھی چوں کہ پرویز کے لیے گود میں کسی بچے کا لوگوں سے ہم کلام ہونے کا معجزہ قابل قبول نہیں لہٰذا وہ تاویلاتِ فاسدہ کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے۔ قرآن کریم میں تو ہے ”کہ مریم اسے (حضرت عیسیٰؑ کو) اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں“۔ کیا

۷۲۔ مریم: ۲۷۔۳۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مریمؑ نے کسی بچے کو گود میں اٹھایا تھا یا تیس سالہ بھرپور جوان بیٹے کو کندھوں پر لادا تھا؟ جب بہ قول پرویز حضرت مریم کا بہ‌زعمِ خود شوہر یوسف بھی ساتھ تھا تو لوگوں نے طعن و تشنیع کے لیے حضرت مریمؑ ہی سے کیوں مکالمہ کیا اور حضرت مریمؑ نے بھی جواباً یوسف کی بہ جائے حضرت عیسیٰ ہی کی طرف اشارہ کیوں کیا؟ حضرت مریم تو لوگوں کے خیال میں (معاذاللہ ثم معاذاللہ) بدکار تھی تو کیا مریمؑ کے بہ‌زعمِ خود شوہر کو لوگ پاک باز سمجھتے تھے اور کیا اس کے گلے میں انہوں نے پھول ڈالے تھے؟ جب یوسف بھی وہاں موجود تھا اور پرویز کے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا نہیں ہوئے تھے بل کہ (معاذاللہ ثم معاذاللہ) یوسف کے بیٹے تھے تو حضرت عیسیٰ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ اللہ نے مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے آپ نے یہاں صرف ماں کا ذکر کرنے کی بہ جائے ماں باپ دونوں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ کیا اللہ نے آپ کو باپ کے ساتھ بدسلوکی کا حکم دے رکھا تھا؟ مستقبل کی کسی اہم خبر کے لیے کبھی ماضی کے صیغے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً سورہ انشراح مکی سورت ہے، مکی زندگی اور اس کے بعد مدنی زندگی کے ابتدائی چند سال بھی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے لیے سخت مصائب اور شدید ترین ابتلاء و آزمائش کے تھے لیکن سورہ انشراح میں ماضی کے صیغوں میں آپ کو بشارت دی گئی ہے کہ ہم نے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا ہے جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی ہے اور یہ کہ ہم نے آپ کا ذکر آپ کے لیے بلند و بالا کر دیا ہے حال آں کہ ان بشارتوں کا عملی ظہور تو بعد میں کہیں جا کر ہوا۔ اسی طرح سورۂ مریم کی متعلقہ آیت میں حضرت عیسیٰؑ نے بچپن میں گود میں ہی کلام کرتے ہوئے قوم کو یہ جو خبر دی تھی کہ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے تو اس کا مطلب بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قضاء و قدر میں مجھے کتاب دینے اور نبی بنانے کا فیصلہ کر دیا ہے۔

ب: سورۂ فیل میں اللہ تعالیٰ نے مکہ پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے آنے والے ابرہہ کے لشکر کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے۔ اس لشکر میں ہاتھی بھی تھے اس لیے ان لوگوں کو اصحاب الفیل (ہاتھیوں والے) کہا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے جو انہیں پتھریلے کنکر مار رہے تھے اس طرح انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔ مسٹر پرویز کے لیے ابرہہ کے لشکر کا اس معجزانہ انداز سے تباہ ہونے کا تصور سوہانِ روح بن رہا تھا۔ اس لیے انہیں خاصی دل چسپ اور مضحکہ خیز تاویلاتِ فاسدہ کا سہارا لینا پڑا۔ ان کے خیال میں یہ پرندے چیلوں اور گِدھوں کے جھنڈ تھے جو عام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر لشکر کے ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں، کیوں کہ انہیں فطری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں گی۔

اس طرح یہ پرندے اصحاب الفیل کے سر پر منڈلاتے ہوئے آ گئے جس سے اہل مکہ نے دور سے بھانپ لیا کہ پہاڑ کے پیچھے کوئی لشکر آ رہا ہے۔ چناں چہ اصحاب الفیل کی مکہ پر اچانک حملہ آور ہونے کی خفیہ تدبیر طشت از بام ہوگئی اور اہل مکہ نے پہاڑ پر چڑھ کر ان پر سخت پتھراؤ کیا جس سے ابرہہ کا لشکر کھائے ہوئے بھوسے کی طرح ہو گیا۔[۷۳] پرویز کی مذکورہ مضحکہ خیز تفسیر مردود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں متعدد غزوات ہوئے۔ آپ سے پہلے اور بعد میں بھی بارہا میدانی جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ کیا کبھی کسی نے جنگی لشکروں کے ساتھ ساتھ چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ کو اڑتے دیکھا ہے؟ سورۂ فیل میں "سجّیل" کا لفظ آیا ہے۔ سجّیل اس مٹی کو کہتے ہیں جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے۔ خود پرویز صاحب نے اپنی لغات القرآن میں سجّیل کا یہ ہی معنیٰ لکھا ہے۔ ایسے پتھر اور کنکر پہاڑوں پر نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی ایسے پتھروں سے اس لشکر کا مقابلہ ممکن ہے جس میں ہاتھی بھی ہوں۔ سورۂ فیل میں ابرہہ کے لشکر پر سجّیل پھینکنے کی ضمیر پرندوں کی طرف ہے لیکن مسٹر پرویز نے یہ سجّیل (پتھریلے کنکر) اہل مکہ کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ شاید غلام احمد پرویز پر بھی کوئی وحی اترتی ہوگی جس سے انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ اہل مکہ نے باہر نکل کر ابرہہ کے لشکر کا باقاعدہ مقابلہ کیا تھا۔ تاریخ سے تو ایسی کوئی شہادت ہرگز نہیں ملتی بل کہ طبقاتی تواتر سے ہم تک یہ ہی بات پہنچتی ہے کہ اہل مکہ ابرہہ کے اس لشکر کا مقابلہ کرنے سے یک سر قاصر تھے اور یہ کہ ابرہہ کا لشکر مکہ سے باہر وادئ محسّر میں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے پرندوں کی سنگ باری کے غیبی عذاب سے تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

حدیث دشمنی میں متعلقہ قرآنی مضامین سے مجرمانہ چشم پوشی اور کتمانِ حق

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ کسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر قرآنی مضامین میں سے بعض کو تو اپنی خواہشات کے مطابق اس غلط انداز میں پیش کیا جائے جس سے انکارِ حدیث کی راہ ہم وار ہو لیکن جو مضامین متعلقہ احادیث کے مفہوم کے عین مطابق بھی ہوں انہیں نظر انداز کرتے ہوئے یہودیوں کی طرح کتمانِ حق سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً:

۷۳۔ پرویز۔ مفہوم القرآن: ص ۱۴۸۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الف: سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اور ہم ضرور بالضرور کسی نہ کسی طرح تمھاری آزمائش (دشمن کے) ڈر سے، بھوک سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے کریں گے۔ اور (اے پیغمبر) تو صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دے جنہیں کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے نوازش اور خاص رحمت ہے اور یہ ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں"۔[۷۴] ان آیات سے معلوم ہوا کہ شدائد و مصائب، آفات و بلیات، بھوک پیاس، فقر و فاقہ، دشمن کا خوف، مال و جان اور کھیتی باڑی وغیرہ کے نقصان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ چناں چہ صبر کرنے والے مسلمان اللہ کی خاص رحمت اور اس کی نوازشوں کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ سورۂ زُمر میں ہے اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ[۷۵] "صبر کرنے والوں کو (آخرت میں) ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔ یہ مصائب بعض گناہوں کا کفارہ بھی ہیں اور ان سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ[۷۶] "اور جو مصیبت تم پر آتی ہے تمھارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اور وہ (اللہ) بہت سے گناہ معاف بھی کر دیتا ہے"۔ فقر و فاقہ اور مصائب و شدائد سے دوچار صابر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی رحمتوں کی اگر بشارت دی ہے اور آخرت میں ان سے بے حد و حساب اجر کا وعدہ فرمایا ہے تو رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ان قرآنی مضامین کے عین مطابق ہے کہ میں نے جنت میں ان لوگوں کی اکثریت دیکھی ہے جو دنیا میں فقیر تھے۔ اب دیکھیے غلام احمد پرویز حدیث دشمنی میں قرآن کے مذکورہ مضامین سے بھی بھرپور دشمنی کا اظہار کس چرب زبانی اور کس پُر فریب طریقے سے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> اسلام غلبہ اور قوت کا دین ہے فان حزب اللّٰہ ھم الغالبون۔ قرآن بار بار مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اتنی قوت جمع رکھو کہ مخالفین پر تمھارا رعب چھایا رہے... اور مخالفین یہ

۷۴۔ البقرہ: ۱۰۰۔۱۰۷

۷۵۔ الزمر: ۱۰

۷۶۔ الشوریٰ: ۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نہ نکال دیا جائے کہ قوت وسطوت خدا کے ہاں برگزیدگی کا موجب ہے ان پر غالب آنا ناممکن ہے، لٰہذا انہوں نے اس قسم کی احادیث وضع کرنا شروع کر دیں کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف وناتواں ہیں۔ جن پر محتاجی اور مفلسی چھائی رہتی ہے۔ جو کم زوری اور بے چارگی کے مجسمے ہیں۔ جو دنیا میں ذلیل وخوار ہوں۔ چناں چہ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا" کہ میں نے جنت میں دیکھا کہ اکثریت سے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں فقیر تھے"۔ (۷۷)

پرویز صاحب نے اپنی مذکورہ عبارت میں جس قرآنی آیت کا حوالہ دیا ہے وہ پوری آیت یوں ہے:
وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ (۷۸) "اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی رکھے تو بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی"۔

اس آیت کا تعلق خاص رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب سے ہے جنہیں یہ بشارت دی جا رہی ہے کہ بالآخر غلبہ ان ہی کو حاصل ہوگا اور کفر مغلوب ہوگا۔ کیوں کہ صاحب شریعت نبی یعنی رسول بھی اگر اپنے مخالفین سے مغلوب ہو جائیں اور دینی اصول وفروع لوگوں تک پہنچنے ہی نہ پائیں تو رسول کی بعثت ہی (معاذ اللہ) بے مقصد ٹھہرتی ہے۔ چناں چہ سنت اللہ یہ ہے کہ رسول اپنے مخالفین پر بالآخر غالب آتے ہیں۔ سورۂ مجادلہ میں ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۷۹) "اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ بے شک میں اور میرے رسول ضرور بالضرور غالب آئیں گے بے شک اللہ طاقتور اور غالب ہے"۔ یعنی تقدیر اور لوح محفوظ میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ صاحب شریعت انبیا (رسولوں) کو اپنے مخالفین پر بالآخر غلبہ حاصل ہوگا۔ جس کی ایک صورت یہ ہے کہ مخالفین بالآخر دنیا میں ہی کسی بڑے عذاب کا شکار ہو کر نیست ونابود ہو جاتے ہیں جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب، فرعون اور آل فرعون وغیرہ کا انجام ہوا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے یہ پیغمبر اپنے

۷۷۔ محمد اسلم جیراجپوری۔ غلام احمد پرویز۔ مقام حدیث: ص ۲۲۴

۷۸۔ المائدہ: ۵۶

۷۹۔ المجادلہ: ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھیوں کے ہمراہ مخالفین سے مسلح جنگ کے مکلف و پابند کیے جاتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ صاحب السیف رسول تھے۔ بالآخر ان کے مخالفین شکست خوردہ ہو کر مغلوب ہو جاتے ہیں یا وہ کفر چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو بالآخر غلبہ حاصل ہوا اور جزیرۃ العرب سے کفر مغلوب ہو کر رخصت ہوا۔ پس سورۂ مائدہ میں جس حزب اللہ کو مخالفین پر بالآخر غالب آنے کی بشارت دی گئی ہے تو یہ عام حزب اللہ (اللہ کی جماعت) نہیں بل کہ خاص حزب اللہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ شامل ہیں۔ جہاں تک عام حزب اللہ کا تعلق ہے تو اس کا ذکرہ سورۂ مجادلہ میں یوں ہوا ہے کہ حزب الشیطٰن (شیطان کی جماعت) سے حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کا تقابل کیا گیا ہے۔ حزب الشیطٰن بالآخر خسارے سے دوچار ہوگا جب کہ حزب اللہ کے متعلق ارشاد ہے اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [80] "خبردار! اللہ کی جماعت والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔ یہاں فلاح سے اُخروی کامیابی مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اہل حق دنیا میں کسی بھی صورت میں مغلوب اور کم زور ہو ہی نہیں سکتے۔ جب کم زوری اور مغلوبیت غیر اختیاری ہو اور اس پر اہل حق صبر سے کام لیں تو وہ حزب اللہ سے (معاذ اللہ) باہر نہیں ہو جائیں گے جیسا کہ پرویز تاثر پیش کر رہے ہیں۔ یہ ہی حال فقر و فاقہ کا بھی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ معاشی مسائل کی کمی سے دوچار اہل حق دشمن کے مقابلے میں لازماً مغلوب بھی ہوں جیسا کہ پرویز صاحب نے ناحق ایسا تاثر پیش فرمایا ہے۔ ہم منکرین حدیث سے پوچھتے ہیں کہ بہ مطابق قرآن بنی اسرائیل نے بہت سے انبیاؑ علیہم السلام کو شہید کر ڈالا تھا۔ مثلاً حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جیسے انبیا ان کے ہاتھوں شہید ہوئے تو کیا یہ مجبور و بے بس انبیاؑ علیہم السلام حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کو نہ دینوی حکومت ملی اور نہ ہی وہ معاشی حیثیت سے متمول تھے تو کیا وہ بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ قوم نوح کے متعلق سورۂ شعرا میں ہے قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ؀ [81] "انہوں نے کہا کہ (اے نوح) کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حال آں کہ تیری پیروی تو رذیل لوگوں نے کی ہے"۔ حضرت ہودؑ کی قوم نے آپ سے کہا تھا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ

۸۰۔ المجادلہ:۲۲

۸۱۔ الشعراء:۱۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ ۚ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ O [۸۲] ” اور ہم تو یہ ہی دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے تو یہ وہی ہیں جو ہم میں ذلیل و خوار، نیچے درجے کے اور کم سمجھ والے ہیں۔ ہم تو تمھاری کسی طرح کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھتے بل کہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں“۔ کیا قوم نوح اور قوم ہود کے یہ کم زور اور حقیر خیال کیے جانے والے مومنین بھی پرویزی منکرین حدیث کے نزدیک حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ حضرت موسیٰ کے ساتھی فرعون سے نجات پانے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک قوت و سطوت اور حکومت و سلطنت سے محروم ہی رہے تو کیا وہ بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟

ہجرت سے پہلے مکے میں بہت سے بے بس لاچار اور فقیر و مفلس مسلمان خصوصاً جو غلام اور لونڈی تھے اور مشرکین مکہ کے ظلم و ستم برداشت کر رہے تھے وہ بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ جن مسلمانوں نے مکے سے مدینے ہجرت کی، ان کے فقر و فاقے کا یہ حال تھا کہ غزوۂ خیبر تک انصارِ مدینہ ان کی معاشی کفالت کر رہے تھے اور جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں فقرا مہاجرین قرار دیا ہے [۸۳] اور جن کے متعلق سورۂ منافقون میں ہے کہ مدینے کے منافقین ان فقرا مہاجرین کو اذلّ (ذلیل ترین) سمجھتے تھے۔ [۸۴] تو کیا یہ فقرا مہاجرین بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ غزوۂ خیبر کے بعد بھی مجموعی حیثیت سے مہاجرین و انصار کے فقر و احتیاج کا یہ حال تھا کہ غزوۂ تبوک کے لیے جنگی ساز و سامان کی شدید قلت کا سامنا تھا۔ اسی لیے مسلمانوں کے اس جنگی لشکر کو ”جیش العُسرۃ“ کہا جاتا ہے تو کیا یہ مہاجرین و انصار بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ مہاجرین و انصار میں سے جو لوگ اس عرصہ میں غزوات و سرایا میں شہید ہوئے یا طبعی موت سے دوچار ہوئے کیا وہ حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ مثلاً غزوۂ احد کے شہدا کا یہ حال تھا کہ حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ پر جو چادر کفن کے لیے تھی، اس سے سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے۔ پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا رہ جاتا، آخر ان کے پاؤں پر اذخر گھاس ڈالی گئی تو کیا حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ کیا سید الشہداء حضرت حمزہؓ بھی پرویزی منکرین حدیث کے نزدیک حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ سورۂ

۸۲۔ ہود: ۲۷

۸۳۔ الحشر: ۸

۸۴۔ المنافقون: ۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بروج میں اصحاب الاخدود (خندقوں والے) کم زور اور مظلوم و مغلوب مومنین کا ذکر ہے جنھیں ان کے دشمن نے خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا کیا وہ بھی حزب اللہ میں داخل تھے یا نہیں؟ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو ناحق قتل کر ڈالا تھا کیا یہ مظلوم و مقتول ہابیل بھی حزب اللہ میں داخل تھا یا نہیں؟ کیا مذکورہ مضامین پر مشتمل جو قرآنی آیات ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں یا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کسی عجمی سازش کے تحت قرآن میں آگئی ہیں؟ ہم پرویزی منکرین حدیث کو کہاں تک جھوٹا ثابت کرتے چلے جائیں۔ عقل مند کے لیے تو اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔

ب: مسلمانوں پر فقر و فاقہ کبھی غیر اختیاری اور اضطراری ہوتا ہے جس پر صبر کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ کبھی یہ اختیاری ہوتا ہے کہ ایک غنی شخص دیگر مستحقین پر اپنا مال خرچ کرے خواہ ایسا کرنے سے خود اسے فقر و فاقے کی حالت سے دوچار ہونا پڑے۔ ایسے ایثار پیشہ لوگ بھی اللہ کی رحمت میں داخل ہیں۔ سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے انصارِ مدینہ کی یوں مدح فرمائی ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [85] "اور وہ (ان مہاجرین کو) اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان پر فاقہ گزر جائے اور جو شخص بھی اپنے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا تو یہ ہی وہ فلاح پانے والے لوگ ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ کا فقر و فاقہ بھی اکثر و بیشتر اضطراری نہیں بل کہ اختیاری ہوا کرتا تھا۔ بہ روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دو دو ماہ گزر جاتے تیسرے مہینے کا چاند نظر آجاتا اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں آگ نہ جلتی۔ حضرت عروہؓ نے دریافت کیا کہ تب آپ لوگ کیا کھاتے تھے، فرمایا: بس دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی۔ [86] حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ مجھے علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی میدے کی روٹی کھائی ہو یہاں تک کہ آپ اللہ سے جا ملے اور نہ آپ نے اپنی آنکھوں سے کبھی بھنی ہوئی بکری دیکھی۔ [87] رسول اللہ ﷺ کی رحلت سے ایک دن پہلے حضرت عائشہؓ نے چراغ جلانے کے لیے تیل پڑوسن سے ادھار لیا۔ آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع (کوئی ۷۵ کلو) جَو کے عوض رہن رکھی ہوئی

۸۵۔ الحشر: ۹

۸۶۔ بخاری: ۲ج، ص۹۵۶

۸۷۔ ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔[88] آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے حجرے نہایت چھوٹے اور سادہ تھے۔ آپ نے اپنے لیے کوئی عالی شان محل تعمیر نہیں کروایا۔ حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ فقر و فاقہ خواہ اضطراری ہو یا اختیاری، بہ ہر حال اس پر صبر کرنے کا حسبِ وعدہ بے حد و حساب اُخروی اجر ملتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فقرا اور مساکین کو پسند فرماتے تھے اور خود آپ نے بھی اس دارِ فانی میں فقیرانہ زندگی ہی بسر فرمائی۔ جنت میں فقرا کی کثرت اس لیے بھی ہوگی کہ حضرات انبیا علیہم السلام پر سب سے پہلے یہ ہی فقرا اور مساکین ہی ایمان لاتے ہیں۔ اغنیا کا طبقہ عموماً ازراہ تکبر و عناد حضرات انبیا علیہم السلام کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ لوگ ایمان لانے والوں پر ظلم کرتے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرتے ہیں۔ یہ فقرا اور مساکین ان تکالیف و شدائد پر صبر کرتے اور اپنے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ چوں کہ دنیا میں ان کے پاس فالتو دولت نہیں ہوتی، اس لیے قیامت کے دن ان کا حساب بھی ہلکا ہوگا۔ مال دار لوگ اپنی دولت کا حساب دینے کے مکلف و پابند ہوں کہ مال حلال ذرائع سے کمایا تھا یا حرام سے حاصل کیا تھا اور پھر یہ کہاں کہاں، کب، کیوں اور کیسے خرچ کیا تھا وغیرہ۔ فقرا اور مساکین کو ایسا حساب کتاب دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی اس لیے وہ اغنیاء سے بہت پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی ادعیہ و اذکار میں یہ دعا بھی ہے کہ اے اللہ! مجھے بہ طور مسکین ہی زندہ رکھ اور اسی حالت میں موت دے اور مجھے قیامت کے دن مساکین کے گروہ میں شامل رکھ۔ اب دیکھیے غلام احمد پرویز نے حدیث دشمنی میں رسول اللہ ﷺ کی فقیرانہ زندگی اور آپ کی مذکورہ دعا کا یوں مذاق اڑایا ہے " مسکنت ایسی چیز ہے جسے قرآن نے خدا کا عذاب بتایا ہے۔ یہودیوں کے متعلق کہا کہ ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ[89] غور کیجیے کہاں وہ فقر و فاقہ جس پر صبر کرنے سے قرآنی تعلیم کے مطابق مسلمان اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور بے حد و حساب اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے اور کہاں وہ ذلت و مسکنت جو بعض اوقات کفار پر بہ طور عذاب مسلط کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اختیاری فقر و فاقہ کا رشتہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہودیوں کی مسکنت سے جوڑا جا رہا ہے۔ فقرا مہاجرین کے اضطراری فقر و فاقے پر اور انصار مدینہ کے اخوت و ایثار پر مبنی اختیاری فقر و فاقے پر اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کی جو مدح فرمائی ہے اور اس سلسلے میں

۸۸۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصوری پوریؒ۔ رحمۃ للعالمین: ج ۱، ص ۲۷۴ بہ حوالہ بخاری عن اسود عن عائشہ صدیقہؓ، دار الاشاعت کراچی۔ طبع اول ذی الحجہ ۱۴۱۱ ہجری

۸۹۔ مقام حدیث: ص ۲۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے فقر وفاقہ پر صبر کی جو قرآنی فضیلت و بشارت اہل حق کو اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے اسے مسٹر پرویز نے جس مکاری، عیاری اور ہوشیاری سے چھپاتے ہوئے نہ صرف سنتِ رسول اللہ بل کہ کتاب اللہ سے کھلی عداوت کا مظاہرہ کیا ہے اور ساتھ ہی قرآن پر ایمان کا (جھوٹا) دعویٰ بھی کیا جارہا ہے اس پر یہ ہی کہا جاسکتا ہے۔بئسما یأمر کم بہ ایمانکم ان کنتم مومنین۔

ج: دین کے مختلف شعبوں میں توازن واعتدال شرعاً مطلوب ہے۔یعنی دینی عقائد پر ایمان لانے کے بعد عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق میں توازن قائم رکھا جائے۔ایک شخص مثلاً فرض نماز کے علاوہ سُنن ونوافل کا بھی بہت اہتمام کرتا ہے۔ساری رات قیام کرتا ہے۔دن کا وقت بھی تسبیح وتحمید اور ادعیہ واذکار میں گزارتا ہے لیکن وہ بیوی بچوں، والدین واقارب، پڑوسیوں اور دیگر لوگوں کے حقوق سے یک سر غافل ہے تو وہ ہر گز متقی نہیں کیوں کہ تقویٰ تو ہر طرح کے گناہوں سے اجتناب کا نام ہے۔پس قرآن وسنت میں بعض دینی اعمال کے جو فضائل ومناقب مذکور ہیں ان کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ صرف اسی عمل کو لیا جائے اور دین کے باقی شعبوں سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔مثلاً قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۹۰)" بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو (موت کے وقت) ان پر فرشتے اترتے ہیں اور کہتے ہیں ڈرو نہیں اور نہ ہی غم کھاؤ اور اس جنت کی خوش خبری سن لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا"۔یا مثلاً احادیث میں ہے کہ جس نے صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔اس طرح کے مضامین کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی شخص یہ مانے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور زبان سے یہ بھی زور وشور سے کہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں لیکن وہ مثلاً رسول اللہ ﷺ کی یا کسی بھی رسول اور نبی کی رسالت ونبوت کا انکار کرے یا وہ آخرت کا، فرشتوں کا، آسمانی کتابوں کا منکر ہو یا رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ کو سرے سے حجت (واجب التسلیم) ہی نہ سمجھتا ہو تو بھی وہ جنت میں چلا جائے گا۔یا وہ دینی عقائد پر ایمان تو رکھتا ہے لیکن عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، معاملات ومعاشرت مثلاً حقوق العباد وغیرہ سے بالکل غافل ہے تو بھی لازماً فوراً جنت میں چلا جائے گا۔پس اگر مثلاً کسی پر قتال فی سبیل اللہ فرض ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ

۹۰۔ حٰم سجدہ:۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ صرف اذکار وادعیہ پر اکتفا کرے اور اپنی ذمے داری پوری نہ کرے، اسی طرح قتال فی سبیل اللہ کی ذمے داری تو پوری کرے لیکن عبادات، اللہ کے ذکر یا بندوں کے حقوق سے غافل ہو۔

یہاں بھی منکرین حدیث طرح طرح سے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ مثلاً غلام احمد پرویز لکھتے ہیں: "مومن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہوتی ہے، یہ ہی مجاہدانہ سرگرمیاں اور سپاہیانہ کوششیں ہیں جن کے بعد ایک عبدِ مومن کو جنت ملتی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنت یوں ہی بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ [91] دوسری جگہ ہے أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ [92] یہ تھی وہ جنت جس کا وعدہ قرآن نے کیا تھا یعنی خالص سعی و عمل کا نتیجہ (جزاء بما کانو یعملون) یہ تو تھی قرآن کی تعلیم لیکن اس کے برعکس آپ دیکھیے کہ احادیث کی رو سے جنت کس قدر سستی اور سہل الحصول بنادی گئی"۔ [93]

جناب پرویز کا جنت و جہنم، آخرت اور اخروی مناظر پر جس طرح کا "ایمان" ہے اس کی وضاحت ہم "اسلامی عقائد اور پرویزی منکرین حدیث" کے ذیلی عنوان "آخرت پر ایمان" کے تحت بہ خوبی کر چکے ہیں کہ مسٹر پرویز کا آخرت پر ہرگز ایمان نہیں اور جن قرآنی آیات میں اخروی مناظر کا حال بیان کیا گیا ہے تو مسٹر پرویز نے نہایت ڈھٹائی اور بے باکی سے ان آیات کو اشتراکی نظام معیشت پر چسپاں کرنے کی بھونڈی جسارت فرمائی ہے۔ یہاں وہ مسلمانوں کو "مجاہدانہ سرگرمیوں" اور "سپاہیانہ کوششوں" سے جنت میں جو بھجوانا چاہتے ہیں تو اس کا واحد مقصد انہیں کسی نہ کسی طرح احادیث رسول اللہ ﷺ سے متنفر اور بیزار کرنا ہے۔ تاہم مسٹر پرویز کی مذکورہ بالا عبارت کے پیش نظر درج ذیل اہم نکات توجہ طلب ہیں:

۹۱۔ البقرہ: ۲۱۴

۹۲۔ آل عمران: ۱۴۲

۹۳۔ مقام حدیث: ص ۲۰۹۔ ۲۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ پرویز صاحب نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ کی راہ میں دشمن سے قتال کیے بغیر اور اس راہ میں تکلیف اور مشقت اٹھائے بغیر کسی کو بھی جنت ہرگز نہیں مل سکتی۔ حال آں کہ مذکورہ بالا آیات میں صحابہ کرامؓ پر قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت اس پس منظر میں واضح کی گئی ہے کہ مدنی دور میں مسلمان چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور آئے دن دشمنوں کے مسلح حملوں کا انہیں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کی عددی قوت بھی دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھی اس لیے ابتدا میں ہر مسلمان پر (چند استثنائی مثالوں کے علاوہ) قتال فی سبیل اللہ فرض عین تھا اور وہ اس فرض کو رضا کارانہ طور پر پورا کرنے کے پابند تھے۔ انہیں کوئی باقاعدہ تن خواہ نہیں ملتی تھی۔ صرف مال غنیمت سے انہیں حصہ ملتا تھا۔ ان دنوں قتال فی سبیل اللہ سے معمولی سے معمولی غفلت بھی مدینہ منورہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لیے نہایت ہی خطرناک اور تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن بعد میں قتال فی سبیل اللہ ہر کسی پر فرض عین نہیں رہا بل کہ اس کی حیثیت فرض کفایہ کی ہو گئی۔ چناں چہ سورۂ نساء میں ہے لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا[۹۴]۔ "اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور بغیر کسی عذر کے بیٹھ رہنے والے مومنین باہم برابر نہیں۔ اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دے رکھی ہے اور ویسے تو اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے لیکن مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت دے رکھی ہے"۔ دیکھیے اس آیت میں اگرچہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے بہت بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی بلا عذر بیٹھ رہنے والے مومنین سے بھی اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ کیا قاعدین کا معنی "بیٹھ رہنے والوں" کا نہیں ہے؟ اگر کسی مومن کو بیٹھے بٹھائے اللہ کے فضل و کرم سے جنت مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی اس لامحدود رحمت پر پرویز اس قدر کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ یقیناً حدیث دشمنی کی نحوست سے قرآن بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ بلا عذر بیٹھ رہنے والوں پر مجاہدین کی فضیلت جزوی یعنی صرف جہاد کی بنا پر ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ دیگر بڑی

۹۴۔ النساء:۹۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیکیوں کی وجہ سے بیٹھ رہنے والا مجاہد سے عنداللہ افضل ہو جائے؟ مثلاً کوئی بہت بڑا عالم دین اپنی دینی خدمات کی وجہ سے ایک عام کم علم فوجی سے کہیں زیادہ افضل و برتر ہو سکتا ہے۔

۲۔ بسا اوقات کوئی جسمانی عذر نہ بھی ہو تو بھی ہر شخص کے لیے ہر زمانے میں قتال فی سبیل اللہ ممکن نہیں۔ مثلاً دور حاضر میں فوج کا باقاعدہ الگ محکمہ اور شعبہ قائم کیا جاتا ہے۔ فوجیوں کو باقاعدہ تن خواہ اور دیگر مراعات دی جاتی ہیں لہٰذا جنگی خدمات بھی ان ہی کے سپرد ہیں۔ ہر شخص خواہش کے باوجود بھی فوج میں بھرتی ہونے سے رہا۔ اگر قتال فی سبیل اللہ کے بغیر جنت ملتی ہی نہ ہو تو جو لوگ فوج میں نہیں وہ تو پرویز کے خیال کے مطابق (معاذ اللہ) جنت کے مستحق ہو ہی نہیں سکتے۔ یہاں دل چسپ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ خود پرویز اور پرویزی منکرین حدیث نے شمشیر زنی کے کون سے جوہر دکھائے ہیں اور کون سی سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کے اعلیٰ نمونے پیش فرمائے ہیں؟

۳۔ انبیائے سابقین میں بہت سے ایسے گزرے ہیں کہ وہ صاحب السیف نہیں تھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ہم راہ کفار سے کوئی قتال نہیں کیا۔ کیا پرویزی فکر کے مطابق یہ انبیا علیہم السلام اور ان کے متبعین بھی جنت کے مستحق تھے یا نہیں؟ اور کیا اس زمانے کے مسلح مجاہدین سے ان انبیا علیہم السلام کا مقام و مرتبہ (معاذ اللہ) کم تر تھا؟

۴۔ چوں کہ قتال فی سبیل اللہ ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، اگر ممکن ہو تو بھی فرض عین نہیں بل کہ فرض کفایہ ہے اس لیے اگر رسول اللہ ﷺ نے مرتبۂ شہادت کو صرف جہاد و قتال کے مقتولین کے ساتھ مخصوص کر دینے کی بہ جائے اس کے دائرے کو وسیع فرماتے ہوئے ان لوگوں کو بھی (حقیقتاً نہیں تو حکماً اور مجازاً) شہدا میں شامل فرمایا جو اسہال، طاعون، پانی میں ڈوبنے سے فوت ہو جائیں، مکان کے گرنے سے دب کر یا آگ میں جل کر فوت ہو جائیں یا کوئی عورت وضعِ حمل کی وجہ سے فوت ہو جائے تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے؟ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ شہید کسی بھی طرح کا ہو تو بھی عام ضابطے کے تحت وہ تب ہی اس فضیلت کا حامل ہو گا جب کہ وہ ایمان کے ساتھ دیگر اعمال صالحہ بھی رکھتا ہو۔ ویسے اللہ تعالیٰ جسے چاہے معاف فرمائے اور جسے چاہے عذاب دے اسے کون پوچھ سکتا ہے؟ اس لیے تو اللہ نے قرآن کریم میں واضح اعلان کر رکھا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ[95] ”بے شک اللہ اس (گناہ) کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے علاوہ جس کے لیے وہ چاہے گا اسے بخش دے گا“۔

۹۵۔ النساء۔ ۱۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۔ پرویز نے حدیث نبوی پر لوگوں کا اعتماد مجروح کرنے کے مذموم مقصد کے تحت قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت و فضلیت پر تو دو قرآنی آیات لکھ دیں لیکن کتب حدیث میں انہیں کہیں بھی کتاب الجہاد نظر نہیں آیا۔ ان کتب میں قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت اور فضیلت پر قرآن کریم میں مذکور آیات کی تعداد سے کہیں زیادہ تعداد میں احادیث صحیح موجود ہیں۔ اسی طرح فضائل اعمال پر وہ احادیث تو پرویز کو خوب کھٹکتی ہیں جن سے جنت سہل الحصول معلوم ہوتی ہے لیکن اسی طرح کی قرآنی آیات سے بھی انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ نیز ان احادیث سے بھی آنکھیں بند کرلیں جو جنت کی راہ میں روکاوٹ کو ظاہر کرتی ہیں، مثلاً جس نے نماز جان بوجھ کر چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔ حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھاتی ہے، یا مثلاً چغل خور، چور، زانی، خائن، جھوٹی قسمیں کھانے والے جہنم میں جائیں گے یا یہ کہ خاتمہ خیر پر ہو تو مغفرت ہو جائے گی ورنہ عمر بھر کے اعمال بھی غارت ہو جائیں گے، یا مثلاً حقوق العباد قرضہ وغیرہ معاف نہیں ہوں گے۔ اس طرح کی احادیث کو پرویز صاحب نے کیوں نظر انداز کیا ہے؟ حدیث میں ہے: من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر "جس شخص نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو بے شک نے اس نے کفر کیا"۔ پرویز کو یہ حدیث کیوں نظر نہ آئی؟ وجہ ظاہر ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد ان کے نزدیک نماز پڑھنا ہے ہی نہیں اور اپنی طرف سے اقامت صلوٰۃ کے جو من گھڑت مطالب بیان کیے ہیں ان میں باہم کوئی تعلق ہی نہیں۔ پرویز کو احادیث رسول سے تو عداوت ہے انہیں قرآن کریم میں سورہ نساکی وہ آیت بھی کیوں نظر نہیں آئی جو ہم نے اوپر نکتہ نمبر ا میں لکھی ہے جو مومنین بلا عذر بھی قتال فی سبیل اللہ میں شریک نہیں بل کہ قاعدین (بیٹھ رہنے والوں) میں شامل ہوں گے تو اگرچہ اللہ نے مجاہدین کو ان پر فضیلت دی ہے لیکن پھر بھی اس نے ان بلا عذر بیٹھ رہنے والوں سے بھی بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔

۶۔ جہاد کا لغوی معنیٰ "کوشش" کا ہے یعنی ہر وہ کوشش جو اپنی دینی اصلاح اور معاشرے میں دین کی سربلندی کے لیے کی جائے وہ جہاد میں داخل ہے۔ یوں جہاد کے مفہوم میں وسعت ہے جس میں قتال فی سبیل اللہ بھی بالخصوص داخل ہے۔ کوئی بھی مسلمان اگر قتال فی سبیل اللہ نہ بھی کرے تو بھی دینی اوار و نواہی کی تعمیل میں اس کی پوری زندگی جہاد اور مجاہدۂ نفس پر مبنی ہے۔ صرف نماز ہی کو لیجیے۔ یہ ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے بھاری عبادت قرار دیا ہے۔ دیگر عبادات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تعمیل اسی طرح معاشرتی و معاشی امور میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت آسان کام نہیں ہے، لہٰذا ناحق یہ سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے کہ جنت صرف قتال فی سبیل اللہ ہی سے ملتی ہے۔

د: اگر قرآنی آیات یا احادیث سے بہ ظاہر کسی معمولی عمل پر جنت ملتی نظر آتی ہو تو ایسا اس لیے ہے کہ اہل ایمان کسی معمولی سے معمولی نیکی کو بھی حقیر نہ سمجھیں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھیں کہ اللہ چاہے تو کسی کو معمولی نیکی پر بھی اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے۔ اور اگر کسی قرآنی آیت یا حدیث سے بہ ظاہر کسی معمولی گناہ اور برائی پر بھی سخت وعید ہو تو یہ اس لیے ہے کہ لوگ گناہوں پر دلیر نہ ہو جائیں اور خوب سمجھ لیں کہ اللہ چاہے تو بہ ظاہر کسی معمولی گناہ اور غلطی پر بھی اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے۔ اس نے یوں ہی نہیں فرمایا ہے کہ وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اس طرح کی قرآنی آیات یا احادیث کا یہ مطلب نہیں کہ اہل ایمان اپنے عقائد کی درستی کے بعد دین کے عملی شعبوں میں توازن و اعتدال سے غافل ہو جائیں۔ رہبانیت اسی لیے ممنوع ہے کہ اس میں انسان حقوق العباد بل کہ خود اپنے نفس کے حقوق کو بھی پامال کرتا ہے ورنہ اگر حقوق العباد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی یاد میں کوئی کچھ مدت کے لیے (یا بعض ناگزیر حالات میں) خلوت نشینی اختیار کرے تو اس کا مطالبہ تو خود قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔ سورۂ مزمل میں ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا [۹۶] "اور تو اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور تمام خلائق و علائق سے کٹ کر صرف اسی کی طرف متوجہ ہو جا"۔ پس اس طرح کی احادیث سے رہبانیت کے حوالے سے منکرین حدیث کا انکار محض دھوکہ اور فریب ہے۔

ھ: حدیث میں ہے کہ جس شخص کے ہاں دو لڑکیاں ہوئیں اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کی جب تک وہ اس کے پاس رہیں تو یہ لڑکیاں اسے جنت میں لے جائیں گی۔ [۹۷] یا مثلاً صحیحین میں ہے کہ عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین نابالغ بچے مر گئے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا اور نسائی میں ہے کہ اس بشارت پر ایک عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ جس کے دو بچے ہی مرے ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ دو کے مرنے پر بھی یہ ہی بشارت ہے اور

۹۶۔ المزمل: ۸

۹۷۔ مقام حدیث: ص ۲۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے ایک بچے کی وفات پر جنت کی بشارت دی حتیٰ کہ اسقاط حمل پر بھی۔[۹۸] یا مثلاً موطا امام مالکؒ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو قل ھو اللہ (سورت) پڑھتے ہوئے سن کر فرمایا کہ اس پر واجب ہوگئی۔ کسی نے دریافت کیا کہ کیا واجب ہوگئی؟ فرمایا جنت واجب ہوگئی۔[۹۹] یا مثلاً تلاوتِ قرآن اور مخصوص سورتوں کے فضائل پر متعدد احادیث موجود ہیں۔ ان تمام روایات کا بھی مسٹر پرویز نے خوب مذاق اڑایا ہے حال آں کہ ایسی روایات پر قطعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیوں کہ:

اولاً ان احادیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دیگر شرعی اوامر و نواہی کو نظر انداز کر دیا جائے، مثلاً جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے کا یہ مطلب نہیں کہ باپ کو قتل کر دیا جائے۔

ثانیاً یہ اعتراض بھی لغو ہے کہ ان احادیث سے جنت سہل الحصول دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح کا اعتراض تو کوئی احمق قرآنی آیات پر بھی کر سکتا ہے، مثلاً ہم ان ہی مباحث میں اوپر سورہ حٰم السجدہ کی آیت لکھ چکے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اپنے اس قول پر قائم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو انہیں کہتے ہیں کہ پریشان اور غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں بل کہ تم ہم سے اس جنت کی بشارت حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔[۱۰۰] اور مثلاً بنی اسرائیل کے نافرمان اور جہاد و قتال سے جی چرانے والے لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ[۱۰۱] "اور تم (شہر کے) دروازے میں سے سجدہ کرتے ہوئے گزرو اور (زبان سے صرف) حِطّۃ (بخشش) کہو تو (صرف ایسا کرنے سے ہی) ہم تمھارے گناہ معاف کر دیں گے اور نیک کام کرنے والوں کو ہم اور زیادہ دیں گے"۔ ظاہر ہے کہ جس گناہ گار کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے وہ جنت میں ہی جائے گا۔ دیکھیے یہاں بھی جنت میں جانا بنی اسرائیل کے لیے کتنا آسان بنا دیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے بدقسمتی سے اس فیاضانہ پیش کش سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔

۹۸۔ مقام حدیث: ص ۲۱۹

۹۹۔ مقام حدیث: ص ۲۲۲ بہ حوالہ موطا امام مالکؒ

۱۰۰۔ حٰم السجدہ: ۳۰

۱۰۱۔ البقرہ: ۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثالثاً جن احادیث میں بچیوں کی پرورش اور ان کے ساتھ حسن وسلوک پر جنت کا وعدہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکوں کی پرورش پر کوئی اجر نہیں ملتا بل کہ یہ بشارت اس پس منظر میں دی گئی ہے کہ دورِ جاہلیت میں بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کی نہایت ہی قبیح اور ظالمانہ رسم رائج تھی۔ اور جن احادیث میں نابالغ بچوں کی وفات پر صبر کرنے والی ماؤں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ باپ کو اپنی نابالغ اولاد کی موت پر صبر کرنے کا اجر نہیں ملے گا اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ بالغ اولاد کے فوت ہونے پر والدین کو صبر کرنے پر اجر نہیں ملے گا، بل کہ روایت میں ماؤں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ عموماً عورتیں ہی زیادہ بے صبری اور جزع فزع کا اظہار کرتی ہیں اور نابالغ اولاد کا ذکر اس لیے ہے کہ نابالغ اولاد کی وفات پر ماؤں کو عموماً زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔

رابعًا یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ کسی چیز کے ذکر نہ کرنے سے اس کی نفی لازم نہیں آتی یعنی عدم ذکر سے عدم وجود لازم نہیں آتا لہٰذا اگر کسی بشارت یا وعدہ کا مضمون عام ہو تو متعلقہ شرائط ملحوظ رکھنا ہوں گی خواہ وہ اس بشارت یا وعید کے مضمون میں مذکور نہ بھی ہوں۔ مثلاً ”جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے“ جیسی بشارات عام ہیں لہٰذا دیگر متعلقہ شرائط بھی ملحوظ رکھنا ہوں گی مثلاً ماں کی پر خلوص خدمت کرنے والا مسلمان ہو اور وہ دیگر شرعی اوامر و نواہی کو بھی اکثر و بیشتر ملحوظ رکھتا ہو وغیرہ۔ لیکن اگر کوئی بشارت یا وعید کسی مخصوص شخص، جماعت یا گروہ کے لیے ہو تو اس میں تبدیلی نہیں ہوگی اور لازماً یہ سمجھنا ہوگا کہ اس شخص، جماعت یا گروہ نے تمام متعلقہ شرائط ملحوظ رکھی ہیں یا وہ ملحوظ رکھے تب ہی تو اللہ تعالیٰ یا اس کے پیغمبر نے متعلقہ بشارت یا وعید سنائی ہے۔ مثلاً سورۂ انفال میں ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ[۱۰۲] ”اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنھوں نے (ان مہاجرین کو) ٹھکانا دیا اور مدد کی تو یہ لوگ پکے مومن ہیں۔ ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔“ یا مثلاً صلح نامہ حدیبیہ کے مواقع پر جن صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا

۱۰۲۔ الانفال: ۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"یقیناً اللہ ان مومنوں سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے پس ان کے دلوں میں جو کچھ تھا اس نے معلوم کر لیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا اور انہیں قریب کی فتح عنایت فرمائی"[103]۔ ان بشارات کے متعلق کوئی یہ کہے کہ بہ شرطے کہ یہ صحابہ کرام تادم آخر ایمان اور اعمال صالحہ پر قائم رہے ہوں تو یہ کہنا اس لیے قطعاً غلط ہوگا کہ اگر وہ آخر وقت تک ایمان اور اعمال صالحہ پر قائم و دائم رہنے والے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادۃ ہے انہیں مغفرت، رزق کریم اور اپنی رضامندی کی بشارتیں ہی کیوں دیتا؟ یا مثلاً سورہ لہب میں ہے تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّتَبَّ[104] "ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہوگیا"۔ اس وعید کے متعلق کوئی یہ کہے کہ بہ شرطے کہ وہ مرتے دم تک کفر پر قائم رہے تو یہ کہنا یقیناً غلط ہوگا کیوں کہ ابولہب کی قسمت میں ایمان لانا ہوتا تو عالم الغیب والشہادۃ اللہ تعالیٰ اسے مخصوص کر کے وعید ہی کیوں سناتا؟

خامساً رسول اللہ ﷺ مورد وحی ہیں لہٰذا آپ کی بیان کردہ بشارتوں اور فضائل اعمال کے مضامین من جانب اللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَادُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ[105] "بے شک اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ وہ جس کے لیے جو گناہ چاہے بخش دے گا"۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کسی موحد مسلمان کو اس کی بہ ظاہر کسی معمولی سے معمولی نیکی پر بھی اسے بخش دے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق ہی اللہ تعالیٰ نے کب دیا ہے؟ وہ تو قرآن کریم میں بارہا شاہانہ انداز میں فرما چکا ہے کہ وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ مثلاً سورہ فتح میں ہے: وَلِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا[106] "اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی حکومت ہے وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ تو بہت بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے"۔

الغرض کسی قرآنی آیت سے یا رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث سے جنت بہ ظاہر نہایت آسانی سے ملتی نظر آتی ہو تو نہ تو قرآن کریم پر اور نہ ہی ایسی احادیث پر کسی کو اعتراض کا کوئی حق ہے۔ ایسے ہی متکبر

۱۰۳۔ الفتح: ۱۸

۱۰۴۔ اللھب: ۱

۱۰۵۔ النساء: ۱۱۶

۱۰۶۔ الفتح: ۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احمقوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا[۱۰۷] " (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ اگر تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ان خزانوں کو روک رکھتے اور انسان تو تنگ دل ہے"۔

قیاسی مغالطے اور فریب آمیز عقلی استدلال

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ایک پرویزی انداز یہ بھی ہے کہ قیاسی مغالطوں اور فریب آمیز عقلی استدلال سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً:

الف: سورۂ زخرف میں ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ[۱۰۸] "اور وہ وہی (اللہ) ہے جو آسمانوں میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی۔ اور وہ بڑی حکمت والا اور پورے علم والا ہے"۔ اس طرح کی آیات سے یہ غلط استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں معبود ہے اور آسمانوں کے اجرام فلکی سورج چاند ستارے اور سیارے کسی کی نجی ملکیت نہیں ہیں اور وہی اللہ چوں کہ زمین میں بھی معبود ہے لہٰذا زمین بھی کسی کی نجی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں زمین کو دیگر اجرام فلکی سورج چاند ستاروں اور سیاروں پر قیاس کیا گیا ہے۔ یہاں غلطی یہ کی گئی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اجرام فلکی میں معبود ہے لیکن اس کا معبود ہونا ان اجرام فلکی کے ناقابلِ مِلک ہونے کی علت نہیں بل کہ اصل علّت یہ ہے کہ ستارے تو آگ کے گولے ہیں۔ اسی طرح بہت سے سیارے سائنسی تحقیق کے مطابق انسانوں اور دیگر حیوانات و نباتات کی زندگی کے لیے سازگار ماحول نہیں رکھتے۔ اور جن سیاروں پر بالفرض زندگی ممکن بھی ہو تو بھی وہ زمین پر رہنے والے انسانوں کی رسائی سے باہر ہیں۔ یعنی اصل علّت انسان کی ان سیاروں تک پہنچنے اور مجازی ملکیت کے ذریعے ان سے استفادہ کرنے کی عدم استطاعت ہے اور یہ علت زمین میں نہیں پائی جاتی۔ نیز اجرام فلکی کسی کی اجتماعی ملکیت بھی تو نہیں ہیں تو اگر زمین پر کسی کی نجی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اجتماعی ملکیت کا جواز کہاں سے نکل آیا؟ مزید برآں اگر آسمان و زمین میں اللہ تعالیٰ کے ہی معبود ہونے سے ناحق یہ سمجھ لیا جائے کہ سب اجرام فلکی کے طبعی خواص بھی یکساں ہیں

۱۰۷۔ بنی اسرائیل: ۱۰۰

۱۰۸۔ الزخرف: ۸۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو یہ کہنا بھی درست ہونا چاہیے کہ سورج چاند ستاروں اور سیاروں میں اللہ ہی معبود ہے، سورج آگ کا گولہ ہے اور زمین بھی چوں کہ اجرام فلکی میں سے ایک ہے اور اس میں بھی اللہ ہی معبود ہے لہٰذا زمین بھی آگ کا گولہ ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص استدلال کرے کہ سرسوں کے پودے کو اللہ تعالیٰ نے زمین سے اگایا ہے اور اسے پکا کر کھایا جاتا ہے، ادھر دھتورے کا پودا بھی اسی زمین سے اللہ تعالیٰ نے ہی اگایا ہے لہٰذا اسے بھی پکا کر بہ طور خوراک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس طرح کا استدلال لغو، لچر اور مضحکہ خیز ہے تو زیر بحث قرآنی آیت سے زمین کی نجی ملکیت کے جائز نہ ہونے کا استدلال بھی بعینہٖ اسی طرح لغو اور بے ہودہ ہے۔

ب: سورۂ حٰم سجدہ میں ہے: وَجَعَلَ فِیۡهَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِهَا وَبٰرَكَ فِیۡهَا وَقَدَّرَ فِیۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا فِیۡۤ اَرۡبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ (۱۰۹) "اور اس (اللہ) نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں برکت رکھ دی اور اس میں (زمین پر رہنے والوں کے لیے) چار دنوں میں سامانِ معیشت رکھ دیا جو تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں ہے"۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ کا دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ "پوچھنے والوں کے لیے یہ یک ساں طور پر ٹھیک جواب ہے"۔ غلام احمد پرویز نے اس کا ترجمہ کیا ہے "تمام ضرورت مندوں کے لیے یک ساں طور پر" اور اس سے یہ غلط استدلال کیا ہے کہ زمین کی نجی ملکیت ممنوع ہے یہ ریاست کی ملکیت ہو سکتی ہے جو زمینی پیداوار کو لوگوں میں حسب ضرورت و موقع تقسیم کرے۔ یہ استدلال قطعاً غلط اور بے موقع و محل ہے۔ زمینی پیداوار کے سائلین (ضرورت مندوں) میں صرف انسان ہی نہیں بل کہ دیگر حیوانات و نباتات بھی شامل ہیں۔ سورۂ رحمن میں ہے وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ ۔ (۱۱۰) "اور زمین کو اس (اللہ) نے مخلوق کے لیے بچھا دیا ہے"۔ یہاں زمینی پیداوار سے ضرورت مندوں میں مساوات اور برابری نفس استفادہ میں ہے کہ انسان ہوں یا دیگر حیوانات سب کے سب اسی زمینی پیداوار پر زندہ رہتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ مثلاً چیونٹی اور انسان کی خوراک ایک ہی نوعیت اور وزن و کمیت رکھتی ہے، بل کہ سب انسانوں کی فرداً فرداً خوراک بھی ایک ہی وزن، مقدار اور نوعیت کی نہیں ہوا کرتی، اس آیت سے زمین کی کسی بھی طرح کی ملکیت کا خواہ نجی ہو یا اجتماعی، سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے بل کہ مطلب یہ ہے کہ زمین کا کوئی مالک ہو یا نہ ہو پھر بھی وہ اسی زمینی پیداوار کے استعمال سے اپنی زندگی برقرار رکھتا ہے اور تمام ضروریات زندگی کو پورا کرتا ہے۔

۱۰۹۔ حٰم السجدہ: ۱۰

۱۱۰۔ الرحمن: ۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ج: سورہ حجر میں ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ۔[111] "اسی (زمین) میں ہم نے تمھارے لیے روزیاں بنادی ہیں اور (ان کے لیے بھی) جنھیں تم روزی دینے والے نہیں ہو"۔ اس آیت سے بھی زمین کی نجی ملکیت کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ یہاں مَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ سے انسان کے علاوہ ساری مخلوقات مراد ہیں کہ تم ان کے رازق نہیں ہو بل کہ سب کا رازق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ آیت کے اس آخری جزو سے انسانوں کا نادار طبقہ ہی مراد ہے جو زمین کا مالک نہیں تو اس سے بھی زمین کی نجی ملکیت کا ناجائز ہونا کیسے ثابت ہو گیا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی سب کا رازق ہے خواہ کوئی زمین کا نجی طور پر مالک ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مال دار لوگوں کو ناداروں پر مال خرچ کرنا چاہیے تو زکاۃ اور صدقات وغیرہ کے احکام اسی لیے تو ہیں۔ وللہ میراث السموات والارض وغیرہ آیات کا مطلب بھی واضح ہے کہ آسمانوں اور زمین کا حقیقی مالک اور وارث اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اب وہ انسانوں میں سے اگر کسی کو مجازی طور پر مالک و وارث بنا دے تو اسے کون روک سکتا ہے اور نجی ملکیت کو ناجائز کون قرار دے سکتا ہے؟ چناں چہ سورۃ الاعراف میں ہے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ[112] "بے شک زمین اللہ کی ہے تو وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دیتا ہے"۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے لیے ساری زمین مسجد بنائی گئی ہے[113] اس سے یہ غلط استدلال کیا جاتا ہے کہ چوں کہ مسجد کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی کیوں کہ مسجد عبادت گاہ ہے اور چوں کہ بہ موجب حدیث ساری زمین بھی عبادت گاہ ہے، لہٰذا مسجد کی طرح زمین کے کسی بھی حصے کی نجی ملکیت درست نہیں۔ یہاں غلطی یہ کی گئی ہے کہ مسجد کی عدم ملکیت کی علت محض اس کا عام عبادت گاہ ہونا سمجھ لیا گیا حال آں کہ مسجد خاص عبادت گا ہے جس میں دنیا کے دوسرے کام مثلاً زراعت، تجارت، صنعت، بول و براز، تھوکنا کوئی نجاست ڈالنا اور بلا ضرورت دنیوی باتیں کرنا وغیرہ ممنوع ہیں۔ اگر ساری زمین کو مسجد کی طرح خاص عبادت گاہ قرار دیا جائے تو مسجد کے تمام احکام پوری زمین پر بھی لاگو ہونے چاہیں مثلاً مسجد میں بول و براز کی اجازت نہیں تو باقی زمین پر بھی یہ اجازت نہیں ہونی چاہیے اور یہ

۱۱۱۔ الحجر: ۲۰

۱۱۲۔ الاعراف: ۱۲۸

۱۱۳۔ ترمذی ج۱، ص ۲۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورتیں کسی نہ کسی طرح فضا میں پوری کرنی چاہیں۔ حدیث میں زمین کو مسجد صرف اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں نماز ادا نہ کی جا سکے تو زمین پر جہاں بھی حسب شرائط نماز پڑھی جائے تو ادا ہو جائے گی۔

د: سورۂ بقرہ میں ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ[۱۱۴] "اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ جو ضرورت سے زائد ہو"۔ اس آیت میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اسے خرچ کرنے والے کی صواب دید پر چھوڑا گیا ہے کہ جو مال کسی کے پاس ضرورت سے زائد ہو وہ اسے خرچ کرے۔ ہر شخص کی ضرورتیں دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہیں لہٰذا صدقاتِ نفلیہ کو تو انفرادی صواب دیدہ پر چھوڑ دیا گیا اور صدقات واجبہ زکوٰۃ و عشر وغیرہ کی شرح مقرر کر دی گئی۔ اس طرح کی آیات سے نجی ملکیت کی نفی ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی ریاست کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی املاک زبردستی چھین لے۔ ضرورت سے زائد جو کچھ بھی ہو اور جسے انسان بہ سہولت خرچ کر سکے تو یہ سب کچھ فرد کی ذاتی صواب دید پر چھوڑا گیا ہے کہ تم خود خرچ کرو۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ حکومت تمھاری ضروریات کا تعین کر کے تم سے تمھارے اموال چھین لینے کی مجاز ہے۔

ھ: سورۂ نحل میں ہے: وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ[۱۱۵] "اور اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر روزی میں زیادتی دے رکھی ہے پس جنہیں زیادتی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے زیر دست غلاموں کو اس طرح نہیں دیتے کہ وہ اور یہ اس میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں؟" آیت کا مطلب واضح ہے کہ جب تم اپنے غلاموں کو اتنا مال نہیں دیتے جس سے وہ تمھارے برابر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ یہ کیسے پسند کرے گا کہ تم کچھ لوگوں کو جو اللہ ہی کے بندے اور غلام ہیں، انہیں تم اللہ کے برابر کر دو اور انہیں اللہ کا شریک ٹھہراؤ۔ کیا اللہ نے تمہیں جو دوسروں سے زیادہ روزی دی ہے تو تم اپنے رازق و مالک اللہ کے ساتھ اس کے بندوں کو اس کا شریک ٹھہرا کر اس نعمت کی ناشکری نہیں کر رہے؟ اس آیت میں کلمات: وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ

۱۱۴۔ البقرہ:۲۱۹

۱۱۵۔ النحل:۷۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ انسانوں میں معاشی اعتبار سے جو فرق اور جو اونچ نیچ پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے فطری نظام کے عین مطابق ہے۔ اسے جبری قوانین کے ذریعے ختم کرنا جیسا کہ اشتراکی نظام معیشت میں درست نہیں ہے، مشرکین غیر اللہ کے لیے جو نذر و نیاز نکالتے ہیں یا خلافِ شریعت کاموں پر مال خرچ کرتے ہیں وہ اللہ کی اس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ آیت کا نجی ملکیت کی نفی سے کوئی دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہاں منکرینِ حدیث پر یہ زبردست اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس طرح کی آیات کا جو مطلب تم بیان کرتے ہو کیا رسول اللہ ﷺ کو بھی معلوم تھا یا نہیں ؟ اگر نہیں تو پرویز جیسے لوگوں کو کس وحی سے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کی آیات سے نجی ملکیت کی نفی ثابت ہوتی ہے ؟ اگر رسول اللہ ﷺ کو وہ مطلب معلوم تھا جو آج تم بیان کر رہے ہو تو کیا آپ نے "قرآنی نظام ربوبیت" یا کسی اور نام سے اشتراکی نظام معیشت اپنے دور میں قائم فرمایا تھا یا نہیں ؟ اس مشکل سوال کا ایک جواب پرویز صاحب نے اپنی کتاب "قرآنی نظام ربوبیت" میں یہ دیا ہے کہ جی ہاں! واقعی آپ نے یہ نظام معاشرے میں قائم فرمایا تھا اور دنیا آج تحقیقاتی ادارے قائم کر کے یہ تحقیق کر رہی ہے کہ آپ نے اس دور میں یہ نظام کیسے قائم فرمادیا تھا۔[116] لیکن اسی کتاب میں اس مشکل سوال کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن کی جو تشریح میں کر رہا ہوں اگر یہ درست ہے تو سمجھ لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نظام ضرور قائم فرمایا ہوگا۔[117] پھر اسی مشکل سوال کا تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور کا انسانی ذہن ابھی عہد طفولیت سے ہی باہر نکلا تھا اور اسے آہستہ آہستہ بلوغ و پختگی تک پہنچا تھا لہٰذا اس دور کا انسانی ذہن اس نظام کو سمجھنے سے قاصر تھا۔[118] اس پر مزید سوال پیدا ہوا کہ اگر دورِ نبوی میں صحابہ کرامؓ کا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) نابالغ اور ناپختہ ذہن اس نظام کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر تھا تو بعد میں انسانی ذہن کب اور کس دور میں عہد طفولیت سے نکل کر عہد بلوغت میں پہنچا تھا ؟ اس مشکل سوال کا دلچسپ جواب پرویز نے یہ دیا ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں یہ سعادت صرف مجھے حاصل ہوئی ہے کہ میں نے اس قرآنی نظام ربوبیت کو

۱۱۶۔ پرویز۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۸۰

۱۱۷۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۲۳۔ ۲۲۴

۱۱۸۔ ایضاً: ص ۲۳۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔[119] اس پر سوال پیدا ہوا کہ کیا یہ نام نہاد "قرآنی نظام ربوبیت" ایسا ہی مبہم اور پیچیدہ اور عسیر الفہم تھا کہ اسے نہ تو صحابہ کرامؓ کماحقہ سمجھ اور سنبھال سکے اور نہ ہی بعد کے ادوار میں سوائے پرویز کے کسی اور کو اس کی ہوا لگی تو اس سوال کا دل چسپ جواب پرویز نے یہ دیا۔ جی نہیں بل کہ "قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدّین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے"[120]۔ ایک طرف تو مسٹر پرویز نے صحابہ کرامؓ کے دور کے انسانی ذہن کو ناپختہ، نابالغ اور خام قرار دیا ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں "... لیکن اس زمانے کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر اس سطح پر نہیں آچکی تھی کہ وہ ان اصولوں کو یا ان کی بنیادوں پر قائم کردہ معاشرہ کو شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیزیں ابھی ان کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں ... اور شعوری طور پر دنیا نیوز اس قابل نہ تھی کہ اسے اختیار کر سکتی لہٰذا یہ نظام ختم ہوگیا"۔[121]

دوسری طرف ان ہی جناب پرویز کا عقیدہ ہے کہ یہ نظام ربوبیت پچھلے انبیا علیہم السلام پر بھی نازل ہوا تھا مثلاً سورۂ بقرہ کی ایک آیت ہے: قولوا امنّا باللہ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَآ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰی وَمَآ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ[122] اس آیت کا پرویز نے ترجمہ یوں کیا ہے " ان سے کہہ دو کہ ہم اس نظام کو اپنا نصب العین بناتے ہیں جو ہماری ربوبیت کے ضامن (خدا) کی طرف سے ہمیں ملا ہے اور جو اس سے پہلے ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا تھا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کی وساطت سے انسانوں کو ملا (یہ ایک ہی نظام تھا جو شروع سے آخر تک انسانوں کو ملتا رہا) ہم اس نظام کے لانے والوں میں باہم اگر کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اسی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں"۔[123] اس پرویزی ترجمے سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) کو اپنا نصب العین بنانا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ اللہ کا معنیٰ " نظام ربوبیت" ہے۔ یہ نظام ربوبیت حضرت ابراہیمؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک تمام

۱۱۹۔ ایضاً: مقدمہ، ص ۲۴

۱۲۰۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۶۴

۱۲۱۔ ایضاً: ص ۲۳۴

۱۲۲۔ البقرہ: ۱۳۶

۱۲۳۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انبیا علیہم السلام پر نازل ہوتا رہا ہے۔ آیت کے آخری کلمات وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں ضمیر "اللہ" کی طرف نہیں بل کہ "نظام ربوبیت" کی طرف لوٹتی ہے چناں چہ اس کا پرویزی ترجمہ یہ ہے "ہم اسی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں"۔ یہاں سنگین نوعیت کے متعدد سوالات اور اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ پرویزی فکر کے مطابق جب خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے دور کا انسانی ذہن تازہ بہ تازہ عہد طفولیت سے باہر آیا تھا اور ابھی اپنی پختگی تک نہیں پہنچا تھا تو زمنی ترتیب کے اعتبار سے سابقہ انبیا علیہم السلام کا ذہن تو یقیناً عہد طفولیت کی منازل طے کر رہا ہوگا۔ تو جب رسول اللہ ﷺ کے دور کا انسانی ذہن پرویز فکر کے قرآنی نظام ربوبیت کو کماحقہ سمجھ پانے اور اسے سنبھالنے کی حالت میں نہیں تھا تو بھلا انبیائے سابقین کے زمانے کا ذہن اس نظام کو کیسے سمجھ سکتا تھا؟ جب حضرات انبیا علیہم السلام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچنے والا پرویزی فکر کا نظام ربوبیت ناقابل فہم تھا تو ان حضرات انبیا علیہم السلام کی بعثت کا فائدہ کیا ہوا؟ جب بہ قول پرویز رسول اللہ ﷺ کے دور کا انسانی ذہن ناپختہ اور نابالغ ہونے کی وجہ سے پرویزی فکر کے قرآنی نظام ربوبیت کو کماحقہ سمجھ پانے اور اسے سنبھالنے سے قاصر تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کو بہت زیادہ قبل از وقت کیوں بھیج دیا؟ کیا اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے دور کے انسانی ذہن کو اسی زمانے میں بلوغت تک پہنچانے سے قاصر تھا؟ اگر قرآن نے بہ قول پرویز "واضح الفاظ" میں۔ بتا دیا تھا کہ الدین سے مفہوم قرآنی نظام ربوبیت ہے تو جب بہ قول پرویز اس نظام کو نہ تو صحابہ کرامؓ کا نابالغ ذہن کماحقہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا اور نہ ہی بعد کے ادوار میں سوائے مسٹر پرویز کے اس نظام کو لوگوں کے سامنے رکھنے کی کسی کو سعادت حاصل ہوئی تو اس قرآنی پیغام کو "واضح" کن معنوں میں کہا جا سکتا ہے؟ اگر انبیائے سابقین کے زمانوں کا انسانی ذہن بالفرض بلوغت کو پہنچا ہوا تھا اور بالفرض ان لوگوں نے واقعی پرویزی فکر کا نظام ربوبیت سمجھ لیا تھا اور عملاً نافذ بھی کر دیا تھا اور ادھر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا انسانی ذہن ابھی صرف عہد طفولیت سے ہی باہر آیا تھا تو اس ترقی معکوس اور رجعت قہقری کا کیا سبب ہے اور کیا ان مفروضات کو صحیح تسلیم کرنے سے امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو افضل الامم امم خیر الامم کہنا درست ہوگا؟ سورۂ عنکبوت میں ہے: بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ [۱۲۴] "بل کہ یہ (قرآن) روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں محفوظ ہیں اور ہماری آیتوں سے

۱۲۴۔ العنکبوت: ۴۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو ظالم ہیں"۔ یہاں کلمات أُوتُوا الْعِلْمَ میں ماضی کا صغیہ لایا گیا ہے یعنی یہاں وہ لوگ بالخصوص مراد ہیں جنہیں قرآنی آیات کا مخزن قرار دیا گیا ہے اور جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے اہل علم ٹھہرایا ہے۔ ادھر پرویز صاحب ان صحابہ کرامؓ کے ذہن کو (معاذاللہ ثم معاذاللہ) ایسا ناپختہ، نابالغ اور خام قرار دے رہے ہیں جو پرویزی فکر کے قرآنی نظام ربوبیت کو سمجھنے سے قاصر تھا اور اسے سنبھال ہی نہ سکا حال آں کہ قرآن کے نزول کا واحد مقصد ہی یہ تھا کہ دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت قائم کیا جائے اور بہ قول پرویز قرآن نے مبہم، مشکل اور پیچیدہ الفاظ میں نہیں بل کہ "واضح الفاظ" میں بتادیا تھا کہ "الدین سے مفہوم قرآنی نظام ربوبیت کا قیام ہے "تو بتایئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کو سچا قرار دیا جائے یا مسٹر غلام احمد پرویز کو؟ ان سوالات کا جواب اگر پرویزی منکرین حدیث کے پاس آئیں بائیں شائیں کے علاوہ اور کچھ نہ ہو تو خود مسٹر پرویز کے صائب مشورے کے عین مطابق انہیں "پرویزی قرآنی بصیرت" کو خوش اسلوبی سے خیر باد کہہ دینا چاہیے وہ خود لکھتے ہیں: "اگر یہ (یعنی پرویز تصورات) قرآن کی کسی حقیقت کی تائید کرتے ہیں تو پرویزی ان سے قرآن فہمی میں مدد لیجیے لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز قرآن کے خلاف جاتی ہو تو بلا تامل اسے دیوار پر دے ماریے"۔ (۱۲۵)

ہم جو مسٹر پرویز کی قرآن فہمی کے نمونے پیش کرتے چلے آرہے ہیں تو انصاف پسند اور حق جو حضرات سے امید ہے کہ وہ پرویز صاحب کے مذکورہ مشورے پر عمل کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیں گے۔

قرآن کریم میں وصیت و وارثت، زکوٰۃ و صدقات، خرید و فروخت اور قرض وغیرہ معاشی امور کے متعلق احکام موجود ہیں جو نجی ملکیت کے جواز پر زبردست دلیل ہیں۔ ان کے متعلق غلام احمد پرویز کا خیال یہ ہے کہ یہ سارے احکام صرف عبوری دور کے لیے تھے۔ (۱۲۶) یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عبوری دور اتنا طویل کیوں ہو گیا کہ دور نبوی اور اس کے بعد خلفائے راشدینؓ اور پھر تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں بھی اس کے ختم ہونے اور پرویزی فکر کے قرآنی نظام ربوبیت کے قیام کی کوئی نوبت ہی نہ آئی۔ رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین مکہ جب ہجرت کے بعد مدینہ منورہ پہنچے تو مفلس و نادار مہاجرین کی معاشی کفالت کا مسئلہ بھی دیگر بعض مسائل کی طرح نہایت ہی اہم اور سنگین تھا۔ رسول

۱۲۵۔ پرویز۔ معارف القرآن: ج ۲، ص ۲۹

۱۲۶۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ ﷺ نے مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے درمیان رشتۂ مواخات اسی لیے قائم فرمایا کہ مسلمان دینی اخوت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اس مسئلے کے حل کی طرف متوجہ ہوں۔ چناں چہ انصار مدینہ نے سالہا سال تک مہاجرین کا معاشی بوجھ برداشت کیا اور اور ایثار و قربانی کی لازوال مثالیں سامنے آئیں۔

قرآن کریم میں انصار کی مدح اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے: يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ[۱۲۷] "وہ (انصار مدینہ) ان لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو (مکہ) سے ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور ان (مہاجر بھائیوں) کو وہ اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود ان پر فاقہ گزر جائے"۔ غور کیجیے ان حالات میں اگر رسول اللہ ﷺ انصار کو حکم فرماتے کہ وہ اپنی تمام زرعی جائیدادیں اور دیگر اموال مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کی تحویل میں دے دیں تاکہ مہاجرین و انصار دونوں کی معاشی ضرورتوں کا انتظام و انصرام خود رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک میں ہو تو کیا وہ آپ کی اس خواہش پر نہایت ہی شرح صدر سے لبیک نہ کہتے؟ اگر پرویزی فکر کا نام نہاد قرآنی نظام ربوبیت مقصود و مطلوب ہوتا تو تیرہ سالہ مکی دور کے بعد مدنی دور کی ابتدا میں ہی یہ نظام بہ آسانی نافذ ہو سکتا تھا اس کے لیے لوگوں کو کسی ایسے عبوری دور سے گزارنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی جو کبھی بھی اختتام کو نہیں پہنچا۔ ادھر پرویز صاحب فرماتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود قانون ربوبیت کے مطابق معاشرہ کا قیام ہے۔ پورا قرآن ان تفاصیل سے بھرا پڑا ہے"[۱۲۸] نیز وہ لکھتے ہیں "قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے"۔[۱۲۹] اب جب کہ پرویزی سوچ کے نام نہاد قرآنی نظام ربوبیت کو نافذ کرنے کے رسول اللہ ﷺ کو خوب خوب مواقع حاصل تھے پھر بھی آپ نے اس نظام کو قائم نہیں فرمایا تو دو ہی باتیں ہیں کہ یا تو رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ناکام قرار دیا جائے کہ آپ نے قرآن کے اصل منتہیٰ اور مقصود کو اور الدین کے اصل مفہوم کو باوجود استطاعت و قدرت کے نافذ نہیں فرمایا اور اللہ تعالیٰ کو بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ناکام قرار دیا جائے کہ جس منتہیٰ اور مقصود کے لیے اس نے قرآن اتارا تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے وہ قاصر رہا یا مسٹر غلام احمد پرویز کو جھوٹا قرار دیتے

۱۲۷۔ الحشر: ۹

۱۲۸۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۰۷

۱۲۹۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۶۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے ان کی نام نہاد "قرآنی بصیرت" کو خود ان کے اپنے مشورے کے مطابق دیوار پر دے مارا جائے۔ ہر سچا مسلمان یقیناً یہ دوسری صورت ہی اختیار کرے گا۔

و: سورۂ نساء میں ہے: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا"[۱۳۰]

اے ایمان والو! تمھارے لیے یہ حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ"۔ آیت کا مطلب واضح ہے کسی کی بالغ عورت سے اس کی رضا مندی کے بغیر کسی مرد کا نکاح درست نہیں۔ اس سے منکرین حدیث نے یہ غلط استدلال کیا ہے کہ نکاح فریقین کے ایجاب وقبول سے ہوتا ہے اس لیے اسے باقی رکھنے کے لیے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ چناں چہ اگر بیوی مسلسل روٹھی رہے اور خاوند کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو نکاح باقی نہیں رہے گا۔ یہاں ایک غلطی تو یہ کی گئی ہے کہ ایجاب وقبول اگرچہ انعقادِ نکاح لیے تو علّت ہے لیکن یہ علت بقائے نکاح میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نشہ آور ہونے کی علت شراب میں تو پائی جاتی ہے لیکن دودھ میں نہیں لہٰذا دودھ کو شراب پر قیاس کرنا اور اسے حرام ٹھہرانا درست نہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ انعقاد نکاح کے لیے مرد اور عورت کا صرف ایجاب وقبول ہی کافی نہیں بل کہ اس پر کم از کم دو مسلمان مرد یا ایک مسلمان مرد اور دو مسلمان عورتوں کی بہ طور گواہ موجودگی بھی ضروری ہے۔ اب اگر یہ علت بقائے نکاح میں بھی مانی جائے تو زوجین کی عائلی زندگی کے ہر ہر مرحلے میں ان گواہوں کی موجودگی بھی ضروری ہونی چاہیے۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ بعض استثنائی صورتوں سے ہم اگر صرف نظر کریں تو نکاح بھی عقد بیع وشرا کی طرح ایک معاشرتی و عمرانی معاہدہ ہے۔ عقد بیع وشرا میں بھی فریقین یعنی بائع (فروخت کنندہ) اور مشتری (خریدار) کی باہم رضامندی ضروری ہے لیکن جب بیع منعقد ہو جائے تو اس کی بقا فریقین کی رضامندی پر ہرگز موقوف نہیں ورنہ ادھر ایک سودا طے پائے اور دوسری طرف ایک فریق بعد میں یک طرفہ طور پر سودے کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس سے تو سارے معاشرتی و معاشی نظام میں زبردست ابتری اور بدنظمی پیدا ہو جائے گی۔ چوتھی غلطی یہ ہے کہ اگر بقائے نکاح کے لیے بھی خاوند اور بیوی دونوں کی رضامندی ہر حال میں ضروری ہو تو اس میں صرف بیوی کا راضی نہ ہونا ہی کیوں مدنظر رکھا جائے بل کہ اگر خاوند بقائے نکاح پر راضی نہ رہے تو بھی خاوند کے طلاق دیے بغیر از خود نکاح فسخ ہو جانا چاہیے۔ پانچویں غلطی یہ ہے کہ اگر انعقادِ نکاح کی طرح

۱۳۰۔ النساء:۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بقائے نکاح بھی زوجین کی رضامندی پر موقوف ہو تو جونہی خاوند یا بیوی بقائے نکاح کو ناپسند کریں تو فوراً علیحدگی ہو جانی چاہیے۔ اس میں مسلسل ناراض یا روٹھے رہنے کی قید کا کیا جواز ہے؟ اسی طرح کچھ لوگوں کا غلط استدلال یہ ہے کہ جب انعقادِ نکاح فریقین کی رضامندی پر موقوف ہے تو فسخ نکاح بھی دونوں کی رضامندی پر موقوف ہونا چاہیے اور بیوی کو طلاق دینے کا حق بھی صرف خاوند کے پاس نہیں ہونا چاہیے بل کہ اس کے لیے بھی زوجین کی رضامندی ہونی چاہیے جیسے عقد بیع و شراء کو منسوخ کرنے کے لیے بائع اور مشتری دونوں کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے۔

یہاں غلطی یہ ہے کہ یہ نہیں سوچا گیا کہ عقد بیع و شرا کے منعقد ہونے پر بائع (فروخت کنندہ) اپنی مبیع (فروخت کردہ چیز) کو مشتری (خریدار) کے حوالے کرتا ہے اور اس سے قیمت وصول کر لیتا ہے۔ اس کے بعد بائع اور مشتری کا باہم کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ادھر عقد نکاح سے تو زوجین میں مدت العمر کے لیے باہم تعلق قائم کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس سے باہم عائلی اور خاندانی ربط پیدا ہوتا ہے۔ اس عائلی زندگی میں شریعت نے انتظامی اختیارات خاوند کو سونپے ہیں اور وہی اپنے کنبہ کا معاشی کفیل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا طلاق (جو جائز ہونے کے باوجود ابغض عند اللہ یعنی اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے) کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ لیکن اگر بیوی بجا طور پر محسوس کرے کہ وہ خاوند کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تو اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ اگر خاوند نے اسے طلاق دینے کا اپنا حق سونپ رکھا ہو تو وہ اسے حسب ضرورت و موقع استعمال کر سکتی ہے۔ دوسرا حل یہ ہے کہ کسی مالی معاوضے وغیرہ کے عوض خاوند سے علیحدگی چاہے اور خاوند اسے قبول کر لے تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ اسے خلع کہا جاتا ہے۔ تیسرا حل یہ ہے کہ بیوی عدالت سے رجوع کرے لوگوں کو ممکن حد تک جلد اور بلا معاوضہ انصاف کی فراہمی اسلامی ریاست کی اہم ذمے داری ہے۔

ز: منکرین حدیث معجزات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے دین میں جبر جائز نہیں یعنی کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کے بہ قول معجزہ جسمانی جبر و اکراہ تو نہیں لیکن ذہنی جبر و اکراہ ہے۔ منکرین حدیث کا یہ استدلال محض دھوکہ ہے وجہ یہ ہے کہ ذہنی جبر و اکراہ تو سرے سے ہوا ہی نہیں کرتا کیوں کہ کسی کے دل کا معاملہ یا اس کی باطنی کیفیت ایک غیبی معاملہ ہے۔ رب العالمین (جو عالم الغیب والشہادۃ ہے) کے سوا دوسروں کو کسی کے دل کی باتوں پر از خود اطلاع نہیں ہو سکتی۔ سورۂ نحل میں ہے کہ ”جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے اور دل کھول کر یعنی اپنی مرضی، اختیار اور خوشی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور انہیں نہایت سخت عذاب ہوگا" اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ہاں وہ شخص اس وعید سے مستثنیٰ ہے جسے (کفر پر) مجبور کیا گیا ہو مگر اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو"[۱۳۱] اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو جسمانی تشدد یا خارجی دباؤ سے بہ ظاہر مجبور تو کیا جا سکتا ہے لیکن کسی کی قلبی کیفیت تک دوسروں کو رسائی نہیں ہو سکتی۔ کسی کے دل سے ایمان کو کھرچ کر باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ پس کسی کے دل میں ایمان زبردستی ڈالا بھی نہیں جا سکتا۔ اگر ان اہل باطل کی مراد یہ ہے کہ معجزہ لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے، لہٰذا یہ ذہنی اکراہ ہے تو ان کا یہ دعویٰ قطعاً مردود ہے۔ معجزہ پیغمبر کے سچے ہونے کو تویقیناً ثابت کرتا ہے لیکن کسی کو ایمان قبول کرنے پر ہرگز مجبور نہیں کرتا چناں چہ حضرات انبیاعلیہم السلام کے مخالفین اکثر و بیشتر معجزات دیکھنے کے باوجود بھی کفر پر قائم رہے۔ اگر معجزے سے کسی کو اطمینان قلب حاصل ہو اور وہ اسلام قبول کرلے جیسے فرعون کے جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصاوالا معجزہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیا تھا تو علمی دلائل اور دعوت و تبلیغ سے کسی کو قائل کرنے کا مقصد بھی تو یہ ہی ہوا کرتا ہے پھر تو دعوت و تبلیغ ہی سرے سے بند کر دینی چاہیے۔ پیغمبر کے معجزہ اور ولی کی کرامت سے اسی طرح علمی دلائل کے ذریعہ دعوت و تبلیغ سے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا لازم نہیں آتا بل کہ لوگوں کی صحیح سمت میں رہ نمائی مقصود ہوتی ہے۔ ذہنی جبر و اکراہ تو سرے سے ہوا ہی نہیں کرتا ایک مفروضے کو حقیقت قرار دے کر منکرین حدیث جو نام نہاد ذہنی اکراہ کا قیاس جسمانی جبر و اکراہ پر کر رہے ہیں تو وہ دوسروں کو اور شاید اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ چناں چہ قرآن کریم میں حضرات انبیاعلیہم السلام کے جن معجزات کا ذکر ہے غلام احمد پرویز نے نہایت ہی لچر بل کہ مضحکہ خیز تاویلات سے ان کا انکار کیا ہے اور قرآن کریم میں معنوی تحریف کی ہے مثلاً ہم نے ان مباحث میں اوپر نکتہ نمبر ۱۲ کے تحت اس کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں۔

پرویزی منکرین حدیث نے قرآن کریم کو جس طرح بازیچۂ اطفال بنایا ہے اور جس طرح پورے دین سے مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لیے عقائد و ارکانِ اسلام کو پامال کرنے کی ناپاک مساعی انہوں نے "قرآن" کے نام پر ہی کی ہیں اس کے خاصے نمونے ہم ان مباحث میں پیش کر چکے ہیں۔ ان کی تمام

۱۳۱۔ النحل: ۱۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکری لغزشوں اور پُر فریب شاطرانہ چالوں کا احاطہ واستیعاب یہاں مقصود نہیں۔ جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ انصاف پسند حضرات کے لیے کافی ہے۔

ساتواں حصہ

بعض احادیث پر اعتراضات کا تجزیہ

ماہرین فن احادیث کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کی جانچ پڑتال مسلمہ اصول روایت و درایت کے تحت کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ جو نتائج اخذ کرتے ہیں ان کے متعلق اہل علم میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور ایسی چند استثنائی صورتوں میں جمہور اہل علم کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اہل علم کا یہ طرز عمل مثبت اور تعمیری ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کی سنت کی حفاظت مقصود ہے۔ اس کے برعکس منکرین حدیث رسول اللہ ﷺ کی سنت کو دین میں سرے سے حجت (Authority) ہی نہیں سمجھتے۔ احادیث پر تنقید سے ان کا مقصد مثبت تحقیق ہرگز نہیں بل کہ ان کا طرز عمل منفی اور تخریبی نوعیت کا ہوا کرتا ہے۔ تخریبی عمل پر آمادہ ذہن بسا اوقات دھوکے اور فریب سے کام لینے میں بھی عار محسوس نہیں کیا کرتا۔ بعض احادیث پر منکرین حدیث کو اعتراضات کا ہم زیر بحث لاتے ہیں۔

الف: بہ قول منکرینِ حدیث بعض احادیث فحش مضامین پر مشتمل ہیں

منکرین حدیث کا ایک اعتراض یہ ہے کہ بعض احادیث (معاذ اللہ) بے حیائی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ یہاں اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی اور معاشرتی تقاضوں کے تحت جنسی مسائل اور ان کا ذکر بے حیائی میں داخل نہیں ورنہ خاوند اور بیوی کے جنسی تعلق کو سب سے بڑی "بے حیائی" قرار دینا ہوگا۔ طبی درسگاہوں میں علم تشریح الاعضاء (اناٹومی) اور علم افعال الاعضاء (فزیالوجی) کے تحت مردانہ و زنانہ نظام تولید کو بالتفصیل زیر بحث لانے کو بھی بے حیائی میں داخل کرنا ہوگا۔ فقہ اور قانون کی تعلیم اور کتب میں اسی طرح عدالتوں میں جنسی جرائم کی تحقیق اور انصاف کی فراہمی کے لیے جنسی امور، واقعات و حوادث اور متعلقہ مسائل کو زیر بحث لانا بھی بے حیائی میں شامل ہونا چاہیے۔ ایمان اور اعمال صالحہ کی طرف راغب کرنے کے لیے قرآن کریم میں جنت کے حور و غلمان کے جنس کا جو ذکر ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے بھی (معاذ اللہ) قابل اعتراض ٹھہرانا چاہیے۔ اب ہم بعض متعلقہ احادیث و روایات پر نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ حضرت ابو سلمہؓ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہؓ کے بھائی ہم دونوں حضرت عائشہؓ کے پاس گئے تو ان کے بھائی نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے غسل کے متعلق پوچھا۔ تو حضرت عائشہؓ نے ایک برتن منگوایا جس میں کوئی ایک صاع (اڑھائی کلو) پانی تھا۔ پھر انہوں نے غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہایا و بیننا و بینہا حجاب اور ہمارے اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک پردہ تھا"۔(۱۳۲)

یہاں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت ابو سلمہؓ، حضرت عائشہؓ کے رضائی بھانجے تھے جنہیں حضرت عائشہؓ کی بہن ام کلثومؓ بنت ابی بکر صدیقؓ نے دودھ پلایا تھا۔ یوں یہ دونوں حضرات حضرت عائشہؓ کے قریبی عزیز تھے جب کہ فریب دہی کی غرض سے منکرین حدیث کچھ اس طرح کا تاثر پیش کرتے ہیں گویا یہ دونوں حضرت عائشہؓ کے لیے اجنبی اور غیر محرم تھے۔ غسل کے لیے درمیان میں جو پردہ لٹکایا گیا تھا اس کے لیے روایات میں "حجاب اور ستر" کے الفاظ ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ پردہ بہت باریک ہو جیسا کہ منکرین حدیث اس لفظ کا ترجمہ کرنے میں دھوکے سے کام لیتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کا چہرہ اور سر ان دونوں حضرات کا نظر آتا تھا۔ بالفرض نہ بھی نظر آیا ہو تو بھی انہیں علم تھا کہ حضرت عائشہؓ نے غسل کے لیے ایک صاع پانی استعمال کیا ہے اور یہ ہی ایک بات ان کے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ حضرت عائشہؓ بعض لوگوں کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتی تھی جو غسل جنابت کے لیے ایک صاع پانی کو ناکافی سمجھتے تھے۔ وہ سادہ غسل جنابت میں اور اس لمبے چوڑے غسل میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے جس میں میل کچیل کو دور کرنے اور جسم کو خوب صاف کرنے میں واقعی زیادہ پانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چوں کہ غسل جنابت ایک ناگزیر شرعی تقاضا ہے، لہٰذا جب ایک صاع جتنی کم سے کم مقدار میں بھی پانی میسر ہو تو یہ حسب موقع و ضرورت غسل جنابت کے لیے کافی ہوگا۔

۲۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں ایک ہی برتن سے غسل کر لیتے تھے اور آپ مجھے ازار بند باندھنے کا حکم دیتے تھے اور پھر میرے جسم سے اپنا جسم ملاتے تھے اور میں حالتِ حیض میں ہوا کرتی تھی (فیباشرنی و انا حائض) اور آپ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر

۱۳۲۔ بخاری: کتب الغسل، باب الصاع ونحوہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(مسجد سے باہر) میری طرف نکال دیتے تھے اور میں بحالت حیض اسے دھوتی تھی [۱۳۳] اسی طرح کی ایک اور حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں اپنی بیویوں کا بوسہ لے لیا کرتے تھے اور ان کے جسم سے اپنا جسم ملایا کرتے تھے (یقبل و یباشر) مگر آپ اپنی خواہش پر تم سب سے زیادہ قادر تھے"۔ [۱۳۴] اس طرح کی روایات میں لفظ "مباشرت" ہے لیکن منکرین حدیث سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسے "مجامعت" کے معنی میں لے کر لوگوں کو احادیث سے متنفر کرنے کے مذموم عزائم کے تحت خوب خوب دھوکہ دیتے ہیں، کیوں کہ اردو زبان میں عربی کا یہ لفظ عموماً مجامعت کے معنی میں لیا جاتا ہے لیکن ان احادیث میں یہ لفظ صرف اور صرف "جسم سے جسم ملانے" کے معنی میں ہی آیا ہے جیسا کہ روایت کے آخری حصے سے بھی بہ خوبی واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی خواہش پر تم سب سے زیادہ قادر تھے۔ اس طرح کی روایات کا پس منظر یہ ہے کہ جب عورت حالتِ حیض میں ہوتی تو یہودی اس سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتے تھے اور اسے ناپاک سمجھتے تھے۔ ان کے زیر اثر عربوں میں عموماً اور اہل مدینہ میں خصوصاً حائضہ عورتوں کے متعلق نازیبا تصورات حد مبالغہ کو پہنچ چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو اس ظلم سے نجات دلائی کہ حالتِ حیض میں کوئی بھی عورت ناپاک اور اچھوت نہیں ہو جاتی۔ آپ ﷺ نے اس صورت حال کی اصلاح فرمائی اور بتایا کہ اس حالت میں صرف مجامعت ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ خواتین سے میل جول اور ان کے ساتھ کھانا پینا وغیرہ سب کام بالکل درست ہیں۔ تاہم ساتھ ہی حضرت عائشہؓ نے یہ بتا کر کہ رسول اللہ ﷺ اپنی خواہش پر تم سب سے زیادہ قادر تھے۔ مسلمانوں کو متنبہ بھی کر دیا کہ عام لوگوں کو اپنی حائضہ عورتوں سے یا روزے کی حالت میں اپنی بیویوں سے بوس و کنار اور مباشرت (جسم کے ساتھ جسم کو ملانے) سے پرہیز کرنا چاہیے کہ کہیں وہ جائز حدود سے تجاوز نہ کر بیٹھیں۔

۳۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "نبی کریم ﷺ نے بہ حالتِ وضو اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیا پھر نماز کے لیے نکلے لیکن دوبارہ وضو نہیں کیا"۔ [۱۳۵] اس روایت کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ بیوی کا بوسہ لینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

۱۳۳۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۹۱، رقم ۸۶۴ عن عائشہؓ

۱۳۴۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۶۹۶، رقم ۲۹۲۱ عن عائشہؓ

۱۳۵۔ ترمذی۔ کتاب الطھارۃ۔ باب ترک الوضوء من القُبلۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ اپنی تمام ازواج کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر رات اور دن میں دورہ کر لیتے تھے اور وہ گیارہ تھیں۔ قتادہ کہتے ہیں، میں نے انسؓ سے کہا: کیا آپ ان سب کی طاقت رکھتے تھے؟ وہ بولے کہ ہم کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی۔ اور سعید نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ انسؓ نے نو بیبیاں بیان کیں''۔ [۱۳۶]

یہاں دورہ سے مراد مجامعت نہیں ہے کیوں کہ شب بسری کے لیے آپ نے ازواجِ مطہرات کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں لہٰذا شب بسری کے اوقات میں گیارہ بیویوں کے پاس جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دن کے اوقات یا شب بسری کے اوقات سے پہلے ایک ہی ساعت میں گیارہ بیویوں کے گھروں میں تشریف لے جاتے تھے تمام گھروں کی خیر و عافیت معلوم کرنا اور گھریلو ضروریات کا پتہ لگانا اور انہیں پورا کرنا آپ کا اصل مقصد ہوا کرتا تھا۔ مختصر وقت میں یوں سب گھروں میں جانا اور ازواج مطہرات کی خبر گیری اور ان کی گھریلو ضروریات کی تکمیل جس جسمانی قوت، چستی و پھُرتی اور ہمت و عزم کا تقاضا کرتی ہے اسے تیس مردوں کی قوت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس سے صرف قوت مردمی مراد لینا اور دورہ سے ایک ہی ساعت میں تمام بیویوں سے مجامعت مراد لینا اسی شخص کی سوچ ہو سکتی ہے جس کا ذہن محض جنسی تصورات کی آماج گاہ ہو۔ ازواج مطہرات کی تعداد نو اور گیارہ میں اہل علم نے یوں تطبیق دی ہے کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات نو تھیں اور حضرت ماریہ قبطیہؓ اور حضرت ریحانہ قرظیہؓ آپ کی دو باندیاں تھیں۔ سب ملا کر گیارہ خواتین ہوئیں۔

۵۔ بہ روایت حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کے ہم راہ آپ کی کسی بیوی نے اعتکاف کیا اور وہ خون اور زردی (خارج ہوتے) دیکھتی تھیں اور نماز پڑھنے کی حالت میں طشت ان کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ [۱۳۷] یہ حدیث صحیح بخاری میں کتاب الحیض کے ذیلی عنوان باب الاستحاضہ کے تحت ''اعتکاف المستحاضہ'' میں دی گئی ہے۔ بہ حالتِ حیض عورت کو نماز معاف ہے، لیکن استحاضہ مرض ہے جس میں عورت کو حیض کے طبعی خون کے علاوہ خون آتا ہے۔ اس میں نماز معاف نہیں ہے۔ اس حالت میں عورت میں مسجد بیٹھ سکتی ہے جہاں خواتین کے لیے ایسا انتظام موجود ہو۔

۱۳۶۔ مقام حدیث: ص ۲۲۰ بہ حوالہ بخاری

۱۳۷۔ ایضاً: ص ۲۲۱ بہ حوالہ بخاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ سورۂ بقرہ میں ہے: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۱۳۸)
"تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں سو تم اپنی کھیتی میں آؤ جس طرح بھی چاہو"۔ یہودی یہ کہا کرتے تھے کہ اگر عورت کو پیٹ کے بل لٹا کر مباشرت کی جائے تو اس سے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تردید میں کہا جارہا ہے کہ عورت سے جس طرح چاہو مباشرت کرو لیکن اس کے لیے بہر حال عورت کی فرج ہی استعمال ہو کیوں کہ وہی محل ولد (بچہ پیدا ہونے کا مقام) ہے اور آیت میں لفظ "حرث" بہ معنی کھیتی اسی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ جو بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب ہے کہ وہ اس آیت کے تحت عورت کے ساتھ وطی فی الدبر کو جائز سمجھتے تھے تو سے ان کی مراد "وطی فی الفرج من جانب الذبر" ہے یعنی عورت سے پچھلی طرف سے اس کی فرج میں وطی جائز ہے، قوم لوط والا عمل ہر گز مراد نہیں جن کو مغالطہ ہوا ان کا قول مردود ہے۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں مذکورہ آیت کے ضمن میں متعلقہ احادیث جمع کر دی ہیں کہ عورتوں سے قوم لوط والا عمل کرنے والا ملعون ہے۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی اس کی ممانعت بڑے واضح کلمات میں موجود ہے۔ مسند دارمی ہے کہ جب حضرت ابن عمرؓ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: وهل يفعل ذالك احد من المسلمين؟ (۱۳۹) "کیا مسلمانوں میں سے کوئی ایسا کام کر سکتا ہے؟" اس روایت کے متعلق ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور یہ اس حقیقت کو قطعیت سے واضح کرتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اس فعل کو حرام سمجھتے تھے۔ نیز ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ نسائی، طبرانی اور ابن مردویہؒ نے ابوالنظر سے روایت کی ہے کہ اس نے نافع مولیٰ ابن عمرؓ سے کہا آپ پر کافی لے دے ہو رہی ہے کہ آپ نے ابن عمرؓ سے اتیان فی الدبر کا فتویٰ لکھا ہے تو انہوں نے فرمایا: کذبوا علی کہ ان لوگوں نے مجھ پر جھوٹ باندھا ہے۔ میں حقیقت حال بتاتا ہوں۔ ابن عمرؓ قرآن پڑھ رہے تھے میں پاس تھا۔ جب نساء کم حرث لکم تک پہنچے تو کہنے لگے کہ اے نافع! کیا تو اس کا شان نزول جانتا ہے؟ میں نے کہا، نہیں تو وہ کہنے لگے ہم قریشی جب مدینہ میں آگئے اور انصار کی عورتوں سے شادی کی، ہم نے حسبِ منشا جماع کرنا چاہا تو

۱۳۸۔ البقرہ: ۲۲۴
۱۳۹۔ سنن الدارمی: رقم ۱۱۸۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہوں نے ناپسند کیا۔ کیوں کہ انصاری خواتین سے یہودی عورتوں کی طرح صرف پہلو کی سمت سے جماع کیا جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آیت نساء کم حرث لکم تا آخر اتاری کہ تم اپنی کھیتی میں ہر طرح آسکتے ہو۔

۷۔ عطاء روایت کرتے ہیں کہ میں نے چند اشخاص کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے سنا کہ ہم اصحاب محمد ﷺ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا۔ نبی ﷺ ۴ ذی الحجہ کی صبح کو (مکہ) پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ (عمرہ پورا ہونے پر) اپنے احرام کھول ڈالو۔ (یعنی حج کے ساتھ عمرہ کو بھی ملاؤ) اور (احرام کھولنے کے بعد) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ۔ عطاء بیان کرتے ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ) کا یہ حکم وجوب کے طور پر نہ تھا بل کہ امرِ اباحت تھا کہ تمھارے لیے احرام کھولنے کے بعد بیویوں کے پاس جانا ممنوع نہیں بل کہ جائز ہے۔ اس پر ہم یہ کہہ رہے تھے کہ عرفات تک پہنچنے میں صرف پانچ دن تو رہ گئے ہیں اور آپ نے ہمیں اپنی بیویوں کے پاس جانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ گویا ہم عرفات میں اس طرح پہنچیں کہ ہمارے اعضائے مخصوصہ سے تقاطر منی ہو رہا ہو (تقطر مذاکیرنا المنی) الحدیث۔[۱۴۰] دورِ جاہلیت میں ایام حج میں عمرہ کرنے کو انتہائی سنگین اور بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ عمرے کے لیے عربوں نے رجب کے (قمریہ شمشی) مہینے کو مخصوص کر رکھا تھا۔ عمرے کو وہ حج اصغر اور ذی الحجہ (قمریہ شمسی) میں حج کو وہ حج اکبر کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جہاں دورِ جاہلیت کی قمریہ شمسی (نسی والی) تقویم کو ہمیشہ کے لیے منسوخ فرما کر حج کو خالص قمری تقویم کے ذی الحجہ میں متعین فرمایا تو وہیں دورِ جاہلیت کو اس باطل تصور کا بھی قلع قمع کیا کہ ذی الحجہ میں حج کے ساتھ عمرے کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔ ایام حج میں عمرہ کرنے کے بعد حج کا احرام دوبارہ باندھا جائے تو اسے اصطلاح میں حج تمتع کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایک ہی احرام کے ساتھ عمرہ اور حج کو جمع کیا جائے تو اسے حجِ قِران کہا جاتا ہے۔ حج کرنے والا اگر قربانی کا جانور ساتھ لایا ہو تو وہ عمرے کے بعد احرام نہیں کھول سکتا بل کہ اسی احرام کے ساتھ اسے حج بھی کرنا پڑتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ حج قِران کا پابند ہو جاتا ہے۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ قربانی کے جانور اپنے ساتھ لے گئے تھے تو آپ نے عمرے کے بعد احرام نہ کھولا لیکن اپنے ان ساتھیوں کو جو ہدی (قربانی کے جانور) اپنے ساتھ نہیں لائے تھے انہیں عمرہ پورا کرنے پر احرام کھول دینے کا حکم صادر فرمایا اور اپنی بیویوں کے پاس جانے کی انہیں بھرپور اجازت دی۔ چوں کہ پرانے اطوار اور رسوم و رواج کو یک لخت چھوڑنا لوگوں کے لیے سخت حیرانی اور

۱۴۰۔ مسلم: کتاب الحج، باب بیان وجوہ الاحرام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تذبذب کا سبب ہوا کرتا ہے اس لیے بعض صحابہ کرامؓ نے تقطر مذاکیرنا المنی کے الفاظ سے اپنی اسی سخت حیرانی، پریشانی اور تذبذب کا اظہار کیا۔ اسی روایت میں آگے چل کر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر فرمایا تھا کہ میں "میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ اگر میرے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمھارے ساتھ احرام کھول دیتا"۔

یہ قول منکرینِ حدیث بعض احادیث توہین آمیز مضامین پر مشتمل ہیں: منکرینِ حدیث کا یہ اعتراض بھی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس طرح کی بعض متعلقہ احادیث پر ہم نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں گناہ گاروں کے لیے سفارش سب سے پہلے سید الانبیا حضرت محمد ﷺ فرمائیں گے۔ اس سے پہلے لوگ باری باری سابقہ جلیل القدر انبیا علیہم السلام سے سفارش کے لیے درخواست کریں گے لیکن وہ اپنی کسی نہ کسی اجتہادی خطا کے حوالے سے معذرت کرتے چلے جائیں گے اور بالآخر یہ سعادت رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوگی۔ اس پر غلام احمد پرویز کا تبصرہ یہ ہے "پھر اس پر بھی غور فرمایئے کہ مختلف انبیائے کرام کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے اس قدر شرمندہ ہوں گے کہ خدا کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ کیا اس قسم کی باتیں رسول اللہ ﷺ کی ہو سکتی ہیں؟۔[۱۴۱]

ہم یہاں الزاماً چند باتیں لکھتے ہیں۔ قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کی یہ دعا مذکور ہے: لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔[۱۴۲] "(اے اللہ) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک میں ہی (اپنے اوپر) ظلم کرنے والوں میں سے ہوں"۔ اور مثلاً حضرت آدم علیہ السلام و حواؑ کی یہ دعا بھی قرآن میں ہے: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ[۱۴۳] "اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور بالضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ اس طرح کی آیات پر اگر کوئی قرآن دشمن زید یہ تبصرہ کرے کہ ان سے تو حضرت آدمؑ اور حضرت یونسؑ جیسے انبیا کا (معاذ اللہ) ظالم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ضرور کسی مُلّا نے عجمی سازش کے تحت یہ مضامین قرآن میں ڈال دیے ہیں تو زید کے احمق ہونے

۱۴۱۔ مقام حدیث: ص ۱۷۷

۱۴۲۔ الانبیاء: ۸۷

۱۴۳۔ الاعراف: ۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کسی عقل مند کو شبہہ نہیں ہو سکتا۔ اور مثلاً رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس میں فرمایا ہے: فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـئَلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ‌ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ (۱۴۴) "پھر اگر تو اس وحی کے متعلق شک میں ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ بے شک تیرے پاس حق آپہنچا ہے سو تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو"۔ اس پر ہو سکتا ہے کہ کوئی احمق زید یہ تبصرہ کرے کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کے سچے ہونے میں شک اور تذبذب تھا لہٰذا یہ قرآنی آیت نہیں ہو سکتی۔ اور مثلاً حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے جب ایک قبطی مارا گیا تو اس کے متعلق قرآن میں ہے:
فَوَكَزَهٗ مُوۡسٰى فَقَضٰى عَلَيۡهِ‌ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ‌ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيۡنٌ (۱۴۵)
"تو موسیٰ نے اسے مُکا مارا جس سے اس کا کام تمام ہو گیا (اس پر موسیٰ نے) کہا یہ تو شیطانی کام ہے، یقیناً وہ (شیطان) کھلے طور پر بہکانے والا دشمن ہے"۔ ممکن ہے اس پر کوئی قرآن دشمن احمق زید یہ تبصرہ کرے کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر اور اولوالعزم رسول بھی شیطان کے بہکاوے میں آجاتا تھا لہٰذا یہ آیت بھی کسی عجمی سازش کے تحت کسی ملانے قرآن میں ڈال دی ہے۔ اور مثلاً رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے متعلق سورۂ تحریم کے شروع میں ہی ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ‌ۚ تَبۡتَغِىۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ‌ "یعنی اے نبی! تو اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام ٹھہراتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کی ہے (کیا) تو اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے؟" ممکن ہے اس پر کوئی قرآنی دشمن احمق زید یہ تبصرہ کرے کہ اس سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ تمام پیغمبروں کے سردار اور بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کے مصداق حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا بھی یہ حال تھا کہ وہ (معاذ اللہ) اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیز کو حرام قرار دے لیتے تھے اور یوں آپ اپنی بیویوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ آیت بھی قرآن میں کسی ملانے عجمی سازش کے تحت ڈال دی ہے۔ تو خوب غور کیجیے کہ ایسے کسی قرآنی دشمن زید اور حدیث دشمن غلام احمد پرویز کی کج فہمی بلکہ بدفہمی اور حماقت میں کوئی بال برابر بھی فرق ہے؟ تحقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ بڑا ہے اور پیغمبر اس کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں۔ بڑا چھوٹے کو اس کی معمولی

۱۴۴۔ یونس: ۹۴

۱۴۵۔ القصص: ۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے معمولی غلطی پر تنبیہ کرے تو لسانی محاورات کے مطابق وہ تغلیظاً (سخت الفاظ میں) کلام کرتا ہے اور وہاں حقیقی معنیٰ مقصود نہیں ہوتا بل کہ حقیقت مہجور ہوا کرتی ہے۔ جیسے کوئی استاد اپنے ذہین و فطین شاگرد کو اس کی کسی معمولی غلطی پر اسے نالائق کہہ دے تو اس سے وہ حقیقتاً نالائق نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح سمجھ دار شخص سے معمولی غلطی بھی سرزد ہو جائے تو اس پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ اسے بڑی غلطی قرار دیتا ہے چناں چہ حضرات انبیاعلیہم السلام سے اگر کسی معاملے میں خلاف اولیٰ صورت کا ظہور ہوا ہو تو بھی وہ اسے "بڑا گناہ" قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت کے طالب ہوتے ہیں اور اسی تواضع اور کسر نفسی کی تعلیم وہ افراد امت کو بھی دیتے ہیں تو قیامت کے ہولناک دن کے پیش نظر وہ دنیا میں اپنی معمولی سے معمولی فکری خطاء کو بھی "گناہ" قرار دے کر اگر معذرت کریں گے تو حدیث کے اس مضمون پر اعتراض کرنے والا ایسا ہی احمق ہے جیسے بالکل اسی طرح کے قرآنی مضامین پر اعتراض کرنے والا بد فہم اور احمق ہے اور اس کی ہم اوپر قرآنی مثالوں سے خوب وضاحت کر چکے ہیں۔

۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن عیسائیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ سے کہیں گے:

وَكُنتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيدٗا مَّا دُمۡتُ فِيهِمۡۖ فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِي كُنتَ أَنتَ ٱلرَّقِيبَ عَلَيۡهِمۡ

"اور جب تک میں ان کے اندر موجود رہا تو ان پر گواہ رہا پھر جب تو نے مجھے (دنیا سے) اٹھالیا تو خود تو ہی ان پر نگران تھا"۔[۱۴۶] اسی کا حوالہ دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے دن کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے " اور آگاہ رہو کہ چند آدمی میری امت سے لائے جائیں گے اور فرشتے ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے اس وقت میں کہوں گا کہ اے میرے رب! (یہ) میرے صحابی ہیں تو کہا جائے گا "تجھے نہیں معلوم انہوں نے تیرے بعد کیا کیا نئی باتیں نکالیں اس وقت میں حضرت عیسیٰ ؑ کی طرح کہوں گا وَكُنتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيدٗا جواب ملے گا کہ یہ لوگ تیرے مرنے کے بعد مرتد ہو گئے تھے" یہ عبارت لکھنے کے بعد مسٹر غلام احمد پرویز نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے "یہ سب کچھ (معاذ اللہ) صحابہ کبار کے متعلق کہا جا رہا ہے کیا آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہوگا؟"۔[۱۴۷]

یہاں ہماری طرف سے الزامی جواب یہ ہے کہ کوئی اور نہیں بل کہ یہ ہی پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ نزول قرآن کا واحد اور حقیقی مقصد یہ تھا کہ دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) قائم کیا

۱۴۶۔ المائدہ: ۱۱۷

۱۴۷۔ مقام حدیث: ص ۱۸۷۔۱۸۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے جس میں کسی کی نجی ملکیت نہیں ہوتی اور تمام ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں ہوتے ہیں [۱۴۸] یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم اسی قرآنی نظام ربوبیت کا قیام ہے [۱۴۹] پھر یہ بھی لکھا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے کا انسانی ذہن ابھی تازہ دم اپنی طفولیت کے مراحل سے نکلا تھا اور اسے آہستہ آہستہ بلوغت اور پختگی کی حد تک پہنچنا تھا لہٰذا اس دور کا انسانی ذہن (بہ الفاظ دیگر صحابہ کرامؓ کا ذہن) اس نظام کو کماحقہ سمجھ اور سنبھال نہیں سکا۔ [۱۵۰] اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعد کے ادوار میں بھی میری یہ پہلی کوشش ہے کہ یہ قرآنی نظام ربوبیت میں دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ [۱۵۱] اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا بہ قول پرویز نابالغ، ناپختہ اور خام ذہن قرآن کریم کے نزول کے حقیقی مقصد (قرآنی نظام ربوبیت) کو سمجھنے سے کماحقہ قاصر تھا، حال آں کہ بہ قول پرویز قرآن نے مبہم مشکل یا پیچیدہ کلمات میں نہیں بل کہ "واضح الفاظ" میں اپنے اس مقصد کو اجاگر کیا تھا۔ بعد میں بھی جب پرویز کے زمانے تک انسانی ذہن پختگی کو پہنچا تھا تو بھی قرآن کے اس واضح پیغام اور مقصد کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی "سعادت" صرف اور صرف مسٹر پرویز ہی کو حاصل ہوئی یعنی پرویز کا ذہن تو بالغ پختہ اور کامل تھا مگر صحابہ کرامؓ کا ذہن پرویزی فکر کے مطابق نابالغ ناپختہ اور خام تھا۔ جب پرویز صاحب اس طرح کی ہرزہ سرائی سے دیگر خرابیوں کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی سخت توہین کے مرتکب ہو رہے تھے تو اس وقت وہ کیوں بھول گئے تھے کہ وہ یہ سب کچھ "صحابہ کبار" کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں مسٹر پرویز جو صحابہ کرامؓ سے (جھوٹی) محبت و عقیدت جتا رہے ہیں تو اس کے پیچھے ان کا واحد مذموم مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے لوگوں کو متنفر اور بے زار کیا جائے۔ ورنہ وہ اپنی تحریروں میں قدم قدم پر صحابہ کرامؓ کی توہین کے مرتکب نہ ہوتے۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس حدیث اور سورۂ مائدہ کی متعلقہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب والشہادۃ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے صحابہ کبار کے متعلق ہرگز نہیں فرمایا ہے بل کہ خود پرویزی ترجمے کے مطابق "امت کے چند آدمیوں" کے متعلق فرمایا ہے۔ یہ وہ نومسلم تھے جن کا تعلق مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مکہ کے مولفۃ القلوب سے ہر

۱۴۸۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۰۷

۱۴۹۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۶۴

۱۵۰۔ ایضاً: ص ۲۳۴

۱۵۱۔ ایضاً مقدمہ: ص ۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گز (پھر) ہرگز نہیں بل کہ ان کا تعلق عرب کے دوسرے علاقوں سے تھا جو آپ کی رحلت کے بعد فتنۂ ارتداد کا شکار ہو گئے تھے اور جن کے خلاف حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کبار اصحابہ کے مشورے اور بھرپور تعاون سے جہاد فرمایا اور اس فتنے کا مکمل استیصال فرمایا۔

۳۔ حضرت یوسفؑ مصر میں کئی سال تک قید میں رہے پھر جب آپ نے شاہ مصر کے ایک خواب کی تعبیر بتائی تو اس نے خوش ہو کر ایک قاصد کو بھیجا کہ آپ کو قید خانے سے نکال کر میرے پاس لایا جائے اس پر حضرت یوسفؑ نے قاصد سے کہا کہ اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے ان عورتوں کا حال پوچھو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ (۱۵۲) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جتنے دنوں یوسف قید میں رہے اگر میں ہوتا تو رہائی کے حکم کو ضرور قبول کر لیتا۔ اس پر مسٹر غلام احمد پرویز کا تبصرہ یہ ہے "یہ روایت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی یہودی کی وضع کردہ ہے تاکہ اس سے ان کے ایک نبی (حضرت یوسفؑ) کا کردار بلند نظر آئے اور اس کے مقابل میں نبی اکرمؐ کا مقام (معاذ اللہ) پست ہو جائے لیکن اسے منسوب رسول اللہ ﷺ کی طرف کیا گیا ہے"۔ (۱۵۳)

یہاں ہم الزاماً کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں مثلاً حضرت سلیمانؑ کے متعلق ارشاد ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (۱۵۴) "اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ صبح کی منزل اس کی مہینے بھر کی ہوتی تھی اور شام کی منزل بھی۔ اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور اس کے رب کے حکم سے بعض جنات اس کی ماتحتی میں اس کے سامنے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو بھی ہمارے حکم سے سرتابی کرے ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ جو کچھ وہ (سلیمان) چاہتا جنات اس کے لیے تیار کر دیتے مثلاً قلعے۔ مجسمے اور حوضوں کے برابر لگن اور چولہوں پر جمی ہوئی مضبوط دیگیں"۔ اور مثلاً حضرت یوسفؑ کا نسب نامہ یوں ہے

۱۵۲۔ یوسف: ۵۰

۱۵۳۔ مقام حدیث: ص ۱۸۰

۱۵۴۔ سبا: ۱۲۔ ۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوسف بن یعقوب بن اسحق بن ابراہیم علیہم السلام جیسا کہ سورۂ یوسف کے مضامین سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔(۱۵۵)

اب اگر کوئی قرآن دشمن زید یہ کہے کہ یہ قرآنی مضامین (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کسی یہودی کے وضع کیے ہوئے ہیں، لیکن ملاؤں نے عجمی سازش کے تحت قرآن میں ڈال دیے ہیں، جن سے اسرائیلی انبیا حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسف کا مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے (بہ قول زید) بڑھ گیا ہے، تو بتایئے اس قرآن دشمن زید اور حدیث دشمن مسٹر غلام احمد پرویز کی بیمار سوچ اور کوڑھ مغزی میں کوئی بال برابر بھی فرق ہے؟

تحقیقی جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دیگر انبیا علیہم السلام پر فضلیت من حیث الکل یعنی مجموعی حیثیت سے ہے نہ کہ ہر ہر جزئی کے اعتبار سے۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کے والد، دادا اور پڑدادا سب جلیل القدر نبی ہیں، لیکن یہ شرف دیگر بہت سے انبیا علیہم السلام کی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی حاصل نہیں ہے، اور مثلاً سفری ضروریات کے لیے حضرت سلیمٰنؑ کا تخت تو تیز رفتار ہوائی جہاز کی طرح ہوا میں اڑتا تھا لیکن یہ معجزہ رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیا گیا اور ہجرت کے موقع پر آپ کو غار ثور میں چھپنا پڑا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے ہم راہ اونٹ پر سفر کرنا پڑا۔ تو حضرت یوسفؑ اور حضرت سلیمانؑ کی اس طرح کی فضلیت محض جزئی فضیلت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اگر تواضعاً حضرت یوسفؑ کے صبر کی تعریف فرمائی ہے تو اس سے بھی حضرت یوسفؑ کا من حیث الکل یعنی مجموعی حیثیت سے افضل ہونا اور رسول اللہ ﷺ کا (معاذ اللہ) مفضول ہونا ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ پرویز صاحب اپنی بیمار سوچ کے باوجود عقل مند بن کر دسروں کو بہ زعم خویش دھوکہ دے کر کامیابی کی امید لگائے بیٹھے ہیں کہ لوگ انکارِ حدیث کے فتنے میں ان کے ہم نوا ہو جائیں گے۔

۴۔ بنی اسرائیل کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ برہنہ غسل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے، حضرت موسیٰؑ نہایت باحیا تھے اور ہمیشہ تنہائی میں غسل کرتے تھے، جس پر انہوں نے یہ کہا کہ موسیٰؑ مرض فتق میں مبتلا ہیں، اس لیے ہم لوگوں کے ہم راہ غسل سے اجتناب کرتے ہیں۔ اتفاقاً حضرت موسیٰ ایک روز غسل کرنے گئے اور اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ دیے وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا۔ اور حضرت موسیٰؑ اس کے پیچھے ثوبي یا حجر ثوبي یا حجر (میرے کپڑے اے پتھر، میرے کپڑے اے پتھر) کہتے ہوئے دوڑے یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے انہیں دیکھ لیا اور کہا، واللہ! موسیٰ کو کوئی مرض نہیں ہے اور پتھر ٹھہر

۱۵۵۔ یوسف:۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ (۱۵۶) قرآن کریم کی سورۂ احزاب میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا (۱۵۷) "اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو تکلیف دی پس جو بات وہ کہتے تھے اللہ نے اس (موسیٰ) کو اس سے بری فرمادیا اور وہ (موسیٰ) اللہ کے نزدیک بڑا باوقار تھا"۔ اس آیت کی تفسیر میں مذکورہ حدیث آئی ہے۔ اس پر منکر حدیث غلام احمد پرویز نے لکھا ہے "بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو کبھی کھانا مانگ کر، کبھی پانی مانگ کر، کبھی ایک نیا معبود بنانے کی خواہش کرکے اور کبھی خدا کو علانیہ دیکھنے کی خواہش کرکے اور کبھی جہاد سے انکار کرکے بہت تنگ کیا ہوا تھا اللہ تعالیٰ مومنوں سے فرماتے ہیں کہ تم بھی بنی اسرائیل کی طرح نہ ہوجانا، کیوں کہ جو قوم اپنے رسول کی اطاعت کرنے کی بہ جائے اسے ستاتی ہے تباہ ہوجاتی ہے"۔ (۱۵۸) حدیث کے انکار کے لیے پرویز کا مذکورہ تبصرہ بوجوہ محلِ نظر اور ناقابل قبول ہے۔ اولاً پرویز صاحب کے استاد حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے لکھا ہے: بہ خلاف اس کے نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے"۔ (۱۵۹) جب کسی بھی رسول کا قول و فعل (حدیث) ان منکرین حدیث کے نزدیک سرے سے حجت (واجب التسلیم) ہی نہیں تو حضرت موسیٰ کا قول و فعل بھی بنی اسرائیل کے لیے کیوں کر حجت ہو سکتا تھا تو پرویز صاحب کا یہ لکھنا خود ان کے اپنے نظریات کے مطابق کیا معنیٰ رکھتا ہے "جو قوم اپنے رسول کی اطاعت کرنے کی بہ جائے اسے ستاتی ہے تباہ ہوجاتی ہے"۔ ثانیاً متعدد مواقع پر صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بہ وجوہ تعمیل نہیں کی مثلاً اپنے مرض وفات میں اپنے اردگرد موجود اصحاب سے آپ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس کوئی کاغذ لاؤ میں تمہیں ایسی چیز لکھوادوں جس کے بعد تم کبھی گم راہ نہیں ہوگے۔ اس وقت آپ کو شدید درد لاحق تھا۔ حاضرین میں سے بہ شمول حضرت عمرؓ کسی نے بھی کاغذ پیش نہ کیا، حضرت عمرؓ کا کہنا تھا کہ آپ کو شدید درد لاحق ہے۔ تمھارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے تمہیں اللہ کی کتاب کافی ہے (۱۶۰) اور مثلاً حضرت خولہؓ بنت مالک بن ثعلبہ کے خاوند حضرت اوس بن صامت رضی

۱۵۶۔ مقام حدیث: ص ۱۶۹ بہ حوالہ بخاری

۱۵۷۔ الاحزاب: ۶۹

۱۵۸۔ مقام حدیث: ص ۱۶۶۔ ۱۶۸ ملخصاً

۱۵۹۔ طلوع اسلام: ص ۱۷۔ دسمبر ۱۹۵۰ء

۱۶۰۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۲۴۳، رقم ۲۴۲۲ عن ابن عباسؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ عنہ نے ان سے ظہار کیا کہ تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو، زمانۂ جاہلیت میں اسے طلاق سمجھا جاتا تھا اس لیے وہ سخت پریشان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ظہار کے متعلق ابھی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے آپ نے توقف فرمایا جس سے وہ آپ سے اپنے خاوند کے متعلق مجادلہ اور بحث و مباحثہ کرنے لگیں۔[۱۶۱]

اور مثلاً آپ نے اپنے متبنیٰ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حکم دیا تھا: امسك عليك زوجك واتق الله[۱۶۲] "تو اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھ اور اللہ سے ڈر"۔ لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ نے بالآخر انہیں طلاق دے دی۔ اس طرح کے بعض مواقع پر صحابہ کرامؓ نے جو آپ کی تعمیل نہیں کی تو یا تو حدیث رسول ان کے لیے حجت (واجب التسلیم) تھی ہی نہیں یا حجت تو تھی لیکن دیگر معقول وجوہ کی بنا پر وہ تعمیل نہ کر سکے۔ اگر حدیث رسول خود صحابہ کرامؓ کے لیے بھی حجت اور واجب التسلیم نہیں تھی تو حضرت موسیٰؑ کے اصحاب کے لیے حدیث موسیٰؑ بھی کیسے حجت اور واجب التسلیم ہو سکتی تھی؟ تو پرویز کا یہ لکھنا کیا معنیٰ رکھتا ہے "جو قوم اپنے رسول کی اطاعت کرنے کی بہ جائے اسے ستاتی ہے تباہ ہو جاتی ہے"۔ اگر یہاں دوسری شق اختیار کی جائے کہ حدیث رسول صحابہ کرامؓ کے لیے حجت تو تھی لیکن عدم تعمیل کی دیگر معقول وجوہ موجود تھیں تو اس طرح کے معدودے چند واقعات سے منکرین حدیث کے لیے انکار حدیث پر استدلال کیسے درست ہوا؟ ثالثاً بنی اسرائیل کے جو جرائم پرویز صاحب نے شمار کرائے ہیں کیا ان میں سے کسی ایک کا بھی تعلق موسیٰ علیہ السلام کی ذات مبارکہ سے ہے؟ ادھر سورۂ احزاب کی متعلقہ آیت کا مضمون تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے متعلق جو (نازیبا) باتیں کہی تھیں تو اللہ نے آپ کو اس سے بری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ تم بھی بنی اسرائیل کی طرح رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے متعلق کوئی ایسی بات ہرگز نہ کہو جس سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ مثلاً ایک موقع پر مال غنیمت کی تقسیم میں ایک شخص نے کہا کہ اس تقسیم میں عدل وانصاف سے کام نہیں لیا گیا اس پر آپ غضب ناک ہوئے اور چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا "موسیٰ پر اللہ کی رحمت ہو انہیں اس سے کہیں زیادہ ایذا پہنچائی گئی لیکن انہوں نے صبر کیا"۔[۱۶۳] رابعاً اگر سورۂ احزاب کی

۱۶۱۔ المجادلہ: ۱

۱۶۲۔ الاحزاب: ۳۷

۱۶۳۔ بخاری: کتاب الانبیاء۔ مسلم: کتاب الزکوۃ، باب اعطاء مولفۃ قلوبھم علی الاسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیر نظر آیت میں ایذا سے مراد عام ایذا مثلاً رسول کی تکذیب اور اس کی اطاعت نہ کرنا وغیرہ مراد ہے تو ایسی ایذا تو ہر رسول کو پہنچتی رہی ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ ہی کی کیا تخصیص ہے؟ مثلاً سورۂ انعام میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا[۱۶۴] "اور بے شک تجھ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا جاتا رہا ہے تو انہوں نے اپنے جھٹلانے جانے پر صبر کیا اور ان کو ایذا پہنچائی گئی یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد (بالآخر) آپہنچی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ احزاب کی زیر بحث آیت میں حضرت موسیٰ کو ان کی قوم کی طرف سے جس خاص ایذا کے پہنچانے کے بات کی گئی ہے اس کا تعلق آپ کی ذات مبارکہ سے ہے جس کی وضاحت حدیث میں موجود ہے۔ پس پرویز صاحب کا حدیث پر اعتراض لغو اور لچر ہے۔ پتھر کا کپڑے لے کر بھاگ جانا معجزہ ہے۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاعلیہم السلام کے متعدد معجزات کا ذکر ہے جن کا انکار کرتے ہوئے پرویز صاحب نے مضحکہ خیز اور لچر تاویلات کی ہیں۔

۵۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس ملک الموت کو بھیجا گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے طمانچہ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ ملک الموت اللہ تعالیٰ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جو مرنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ اسے دوبارہ عنایت فرمائی اور حکم دیا کہ موسیٰ کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھیں جس قدر بال ان کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے ہر بال کے عوض انہیں ایک سال کی مزید زندگی دی جائے گی۔ فرشتے نے اللہ کا پیغام پہنچایا تو حضرت موسیٰؑ نے کہا اے پرودگار! پھر کیا ہوگا؟ اللہ نے فرمایا کہ پھر موت آئے گی، تو حضرت موسیٰؑ نے کہا تو پھر ابھی سہی ...[۱۶۵] اس حدیث پر بھی منکرینِ حدیث کا اعتراض لغو ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا مقام و مرتبہ ملک الموت سے بہت بہت بلند ہے۔ ملک الموت نے اجازت لیے بغیر آپ کی جان قبض کرنا چاہی تو موسوی طمانچے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ عالم الغیب والشہادۃ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چناں چہ ملک الموت کو بھی حضرت موسیٰ کی موت کے وقت کا پہلے صحیح علم نہ ہو سکا حال آں کہ جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو اس میں ایک لمحہ کی بھی ہرگز تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

۱۶۴۔ الانعام: ۳۴

۱۶۵۔ مقام حدیث: ص ۳۱۵ بہ حوالہ بخاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ معراج کے موقع پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ حضرت موسیٰؑ کے بار بار کے مشورے سے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر کے نمازوں کی تعداد میں تخفیف کراتے رہے۔ یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں جن کا اجر پچاس نمازوں کے برابر ہی رکھا گیا۔ اس حدیث پر بھی اعتراض کا کوئی موقع نہیں حضرت موسیٰؑ کو اپنی امت کا جو تجربہ ہو چکا تھا اتنا تجربہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کا نہیں ہوا تھا اس لیے ان کے مشورے کو آپ نے قبول فرمایا۔ اگر مقام و مرتبہ میں افضل شخص اپنے سے کم تر درجے کے شخص کے مشورے کو قبول کرلے تو اس سے مشورہ لینے والے افضل شخص کی فضیلت اور برتری ہرگز خلل پذیر نہیں ہوتی۔ مثلاً غزوۂ احزاب کے ایام میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتی خواہش تھی کہ بنو غطفان سے مدینے کی ایک تہائی پیداوار پر مصالحت کرلی جائے تاکہ وہ ابوسفیان کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے جائیں اور اس تجویز پر بنو غطفان کے سرداروں سے کچھ گفت و شنید بھی ہوئی لیکن جب بعد میں آپ نے انصار مدینہ کے اوس اور خزرج قبائل کے سرداروں سے مشورہ فرمایا تو حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما دونوں نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا اس پر آپ نے اپنی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے انصاری سرداروں کے مشورے کو ہی قبول فرمایا۔ اگر ایسا کرنے سے حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ سے افضل نہیں ہو گئے تو حضرت موسیٰؑ کے مشورے کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے بھی حضرت موسیٰؑ کا مقام و مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے نہیں بڑھ گیا۔ سخت احکام میں تخفیف سے اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنے فضل و کرم اور احسان کا اظہار فرماتا ہے تاکہ لوگ اس پر اللہ کا شکر کریں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ذوق و شوق سے کریں۔ مثلاً سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ مسلمان اپنے سے دس گنا دشمن سے قتال کریں پھر اس میں یہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرما دی کہ اللہ کو تمھاری کمزوری کا علم ہے۔ پس اگر تم میں سے ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے یعنی اب تم دس گنا دشمن سے نہیں بل کہ دو گنا دشمن سے لڑو۔ [۱۶۶] ۔ پچاس نمازیں اگر بہ حال رہتیں تو ضروری نہیں کہ نماز کی شرائط اور اس کے ارکان وغیرہ جزئیات وہی ہوتیں جو اب پنج گانہ نمازوں کی ہیں۔ صلوٰۃ سے اللہ کا ذکر مقصود ہے۔ بالفرض پچاس اوقات میں صرف کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا پچاس پچاس مرتبہ ذکر مامور و مقصود ہوتا تو دن بھر میں

۱۶۶۔ الانفال: ۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اڑھائی ہزار مرتبہ اس کلمہ کا ورد ممکن ہونے کے باوجود بار بار کی وقت کی پابندی سے مشکل ضرور ہوتا۔ الغرض حدیث پر منکرینِ حدیث کے اعتراضات کا کوئی علمی وزن نہیں۔

۷۔ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا۔ اس کے اثر سے آپ کو خیال ہوتا تھا کہ ایک کام کیا ہے یا نہیں [۱۶۷] اس حدیث پر اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ جادو کے ذریعہ مخالفین نے ایک طرح کی ذہنی اذیت آپ کو پہنچائی۔ جب شیاطین اللہ کے پیغمبر کو جسمانی اذیت پہنچا سکتے ہیں اسی طرح ایک حد تک وہ ذہنی اذیت بھی پہنچا سکتے ہیں۔ طائف میں مخالفین کی سنگ باری سے رسول اللہ ﷺ زخمی ہوئے۔ غزوۂ احد میں مشرکین کے ہتھیاروں سے آپ کو زخم پہنچے اس سے آپ کے مقام و مرتبہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا اور نہ ہی آپ کو دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں خلل پذیر ہوئیں۔ اگر یہودیوں کے سحر (جادو) سے آپ پر اثر ہوا تو اس میں تعجب اور اعتراض کی کون سی بات ہے؟ بے شک سحر شیاطین کے اثر سے ہوتا ہے تو خوب سمجھ لیجیے کہ شیاطین صرف جنات ہی نہیں انسان بھی ہوتے ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ [۱۶۸] ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن شیاطین پیدا کیے تھے جو انسانوں میں سے بھی تھے اور جنات میں سے بھی تھے“۔ اگر شیاطین کفار کے ہتھیاروں سے اللہ کا رسول زخمی ہو سکتا ہے تو شیاطین کے سحر سے ایک حد تک متاثر بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً فرعون کے جادوگروں کے متعلق سورۂ اعراف میں ہے فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ [۱۶۹] ”تو جب انہوں نے (اپنی رسیوں اور لاٹھیوں کو زمین پر) ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر انہوں نے جادو کیا اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور وہ بہت بڑا جادو لے کر آئے“۔ جادو کے اس اثر سے خود حضرت موسیٰؑ بھی متاثر ہوئے۔ چناں چہ سورۂ طٰہٰ میں ہے فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى [۱۷۰] ”تو اس (موسیٰ) کو خیال گزرنے لگا کہ اچانک ان (جادوگروں) کی رسیاں اور لاٹھیاں ان

۱۶۷۔ مقام حدیث: ص ۳۲۰ بہ حوالہ بخاری

۱۶۸۔ الانعام: ۱۱۲

۱۶۹۔ الاعراف: ۱۸۶

۱۷۰۔ طٰہٰ: ۶۶۔۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے جادو سے زور سے بھاگ دوڑ رہی ہیں۔ پس موسیٰ نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا"۔ حضرت موسیٰؑ وقتی طور پر اس جادو سے ایک حد تک متاثر ہوئے لیکن اس سے آپ کی دعوت و تبلیغ اور دینی امور میں آپ کی مصروفیت اور دل چسپی قطعاً متاثر اور خلل پذیر نہیں ہوئی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ جادو سے اس حد تک تو متاثر ہوئے کہ آپ اپنے ذاتی اور دینوی امور میں تذبذب کا شکار ہونے لگے کہ فلاں کام میں نے کیا ہے یا نہیں۔ بالآخر آپ اس سے بہ مطابق حدیث معوذتین (قرآن کریم کی آخر دو سورتوں) کے ذریعہ شفایاب ہوگئے۔ اگرچہ یہ سورتیں مکی ہیں لیکن جن آیات یا سورتوں کا کسی خاص واقعے سے جب بھی کوئی تعلق قائم ہو تو متقدمین کی اصطلاح میں ان آیات اور سورتوں کو اس واقعے کا شان نزول کہہ دیا جاتا تھا اور اس واقعے سے اس طرح کا تعلق حضرت جبرئیلؑ کی خبر سے ہو تو یہ کہا جاتا ہے کہ متعلقہ قرآنی آیات یا سورتوں کا آپ پر حسب ضرورت و موقع دوبارہ نزول ہوا ہے۔

مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ پر کبھی ساحر کا اور کبھی مسحور کا الزام لگاتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم تو ایک مسحور شخص کی پیروی کرتے ہو۔ مشرکین ایسا اس لیے کرتے تھے کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوں اور جو مسلمان ہو چکے ہیں ان کا اعتماد و اعتبار دین سے اٹھ جائے۔ منکرین حدیث کی بھی پوری کوشش یہ ہی ہے کہ حدیث رسول سے لوگوں کے اعتماد کو کسی نہ کسی طرح مجروح کیا جائے۔ حال آں کہ حدیث میں آپ پر جس جادو کا ذکر ہے اس سے آپ کو حضرت موسیٰؑ کی طرح ایک حد تک محض دینوی ضرر ہوا یا ایسا ضرر ہوا جو صرف آپ کی ذات مبارکہ تک محدود تھا اس سے ایسا کوئی دینی ضرر ہرگز نہیں ہوا کہ دعوت و تبلیغ، لوگوں کی رہ نمائی اور تربیت کے لیے آپ کے روزمرہ کے دینی مشاغل میں کوئی خلل پڑا ہو۔ سورۂ مجادلہ میں ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۱۷۱) "اللہ نے یہ بات (لوح محفوظ میں) لکھ دی ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب رہیں گے بے شک اللہ طاقتور (اور) زبردست ہے"۔ اگر رسول یعنی صاحب شریعت نبی بھی مخالفین سے اس طرح مغلوب ہو جائے کہ اللہ کا دین اور اس کا پیغام رسول کے ذریعے لوگوں تک پہنچ ہی نہ سکے تو اس کی بعثت ہی (معاذ اللہ) بے مقصد اور بیکار ٹھہرتی ہے لہٰذا مخالفین جس طرح کی بھی اذیت اللہ کے رسول کو پہنچائیں (جس میں

۱۷۱۔ المجادلہ: ۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبانوں، ہتھیاروں، سحر و جادو وغیرہ ہر طریقے کی اذیت شامل ہے) تو بھی اللہ کے رسول کا دعوتی، تبلیغی اور دینی مشغلہ خلل پذیر نہیں ہوتا اور بالآخر مخالفین پر پیغمبر کو کھلا غلبہ ہر کسی کو نظر آجاتا ہے۔

۸۔ بروایت حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین مواقع کے سوا کبھی ایسی بات نہیں کہی جو خلافِ حقیقت ہو۔ دو مرتبہ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کیا۔ ان کا یہ کہنا انی سقیم (میں بیمار ہوں) اور یہ کہنا بل فعلہ کبیر ھم ھذا "بل کہ اس بت شکنی کا کام ان میں سے بڑے بت نے کیا ہے۔ اللہ کے لیے تھا"۔ اور تیسری مرتبہ جب آپ سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو جواب میں آپ نے فرمایا کہ یہ میری بہن ہے۔ پھر آپ سارہؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "اے سارہ! روئے زمین پر میرے اور تمھارے سوا اور کوئی مومن نہیں ہے اور اس ظالم نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ میری بہن ہے پس تم مجھے جھوٹا نہ کرنا"۔ رہی خلاف حقیقت بات آپ نے ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے کہی کیوں کہ جس عورت کو بھی وہ ظالم اپنے لیے پکڑتا تو اس کے خاوند کو قتل کروا دیتا تھا۔ اس حدیث میں "کذبات" کے معنی جھوٹ نہیں جیسا کہ منکرین حدیث باور کراتے ہیں۔[۱۷۲] بل کہ "ثلاث کذبات" کے معنی "تین خلافِ حقیقت باتیں" ہے۔ ہر جھوٹی بات خلاف حقیقت بھی ہوتی ہے لیکن ہر خلافِ حقیقت بات کو جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جھوٹ بہ ہر حال معیوب ہے لیکن ہر خلاف حقیقت بات معیوب تو کیا بل کہ بعض اوقات عین مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مرنے والے کی وصیت کو سن لینے کے بعد بدل ڈالے تو اس کا گناہ انہیں لوگوں پر ہے جو اسے بدل ڈالتے ہیں بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[۱۷۳] "ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے زیادتی یا گناہ کی وصیت کر دینے سے ڈرے تو وہ ان میں باہم اصلاح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے"۔ یعنی اگر وصیت کرنے والے نے ایسی وصیت کی ہو جسے پورا کرنا شرعاً ممنوع ہو اور ایسی وصیت کو سننے والا اصلاح کی غرض سے وصیت کے کلمات اور وصیت کا مفہوم بدل ڈالے تو صاف ظاہر ہے کہ وصیت کو یوں بدلنے والا خلاف حقیقت بات ہی تو کہے گا لیکن ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح بعض اوقات علمی مباحث میں یا

۱۷۲۔ مقام حدیث: ص ۳۱۶

۱۷۳۔ البقرہ: ۱۸۱۔۱۸۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی موقع پر جان مال اور عزت کی حفاظت کے لیے خلاف حقیقت بات کہی جائے تو قطعاً کوئی حرج نہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم نے قوم کو سمجھانے کے لیے بالترتیب پہلے ستارے، چاند اور سورج کو اپنا رب قرار دیا پھر واضح کر دیا کہ یہ سب تو کسی کے حکم کے تابع ہیں اسی لیے باقاعدگی سے ان کے طلوع و غروب کا سلسلہ جاری رہتا ہے پس میں تو یک سو ہو کر صرف اسی (اللہ) کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں"۔[۱۷۴] حضرت ابراہیمؑ کی قوم اپنی عید یا کوئی جشن منانے کے لیے گئی تو حضرت ابراہیم نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ان کے بت خانے کے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ قوم نے واپسی پر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کام تو اس بڑے بت نے کیا ہے گر یہ ٹوٹے ہوئے بت بول سکتے ہیں تو تم ان سے پوچھ دیکھو۔ حضرت ابراہیم نے قوم کو سمجھانے کے لیے خلافِ حقیقت بات کہی تو آپ کی یہ ترکیب بڑی کامیاب رہی "فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ"[۱۷۵] "پس ان لوگوں نے اپنے دلوں کی طرف رجوع کیا تو (دل ہی دل میں) کہنے لگے واقعی ظالم تو تم خود ہی ہو"۔ لیکن شرمندگی مٹانے کے لیے وہ کہنے لگے کہ اے ابراہیم! تجھے تو پتہ ہی ہے کہ یہ بت بولتے نہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ کو انہیں شرک پر ملامت کرنے اور ان پر بھرپور انداز میں حجت پورا کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا اور آپ نے فرمایا "تو کیا تم ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکیں اور نہ ہی نقصان؟ اُف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟"[۱۷۶] کبھی ایک بات خلافِ حقیقت ہوتی ہی نہیں لیکن سننے والا اس سے مفہوم قریب مراد لیتا ہے جب کہ بات کرنے والا مفہوم بعید مراد لے رہا ہوتا ہے اسے توریہ کہا جاتا ہے اور خلافِ حقیقت بات کی طرح توریہ کو بھی مجازاً عربی زبان میں "کذب" کہہ دیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے بت پرست اور مظاہر پرست جب اپنے کسی جشن یا عید میں جانے لگے تو انہوں نے حضرت ابراہیم کو بھی ساتھ جانے کی دعوت دی۔ اس پر آپ نے ستاروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا انی سقیم کہ میں بیمار ہوں۔ قوم نے سمجھا کہ انہیں واقعی کوئی جسمانی مرض ہے حال آں کہ آپ کو ان کے ساتھ جانے میں طبعی انقباض تھا۔ طبعیت کے تکدر اور انقباض کو بھی یعنی افسردگی اور اکتاہٹ (Depression) کو بھی مرض ہی سمجھا جاتا ہے گو لوگ اسے جسمانی عارضہ قرار نہیں دیا

۱۷۴۔ الانعام:۷۶۔۷۹

۱۷۵۔ الانبیاء:۶۴

۱۷۶۔ الانبیاء:۶۶،۶۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے۔ اسی طرح مسلمانوں کے باہم دینی تعلق کو دینی اخوت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت سارہؑ واقعی حضرت ابراہیم کی دینی بہن تھیں لیکن ظالم بادشاہ نے سمجھا کہ وہ آپ کی حقیقی نسبی بہن ہے۔ پس منکرین حدیث کا زیر بحث حدیث پر اعتراض لغو ہے ورنہ ان کا یہ اعتراض قرآن کریم پر بھی تو وارد ہوتا ہے انی سقیم اور بل فعلہ کبیر ھم منھم کے کلمات تو قرآن کریم میں ہیں۔

۹۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ یعنی ”میں ایمان لایا کہ اس (اللہ) کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے“۔ تو جبریل نے کہا ”اے محمد! کاش تم مجھے دیکھتے جب میں سمندر کی کالی مٹی اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا کہ کہیں اس کو رحمتِ الٰہی نہ حاصل ہو جائے“۔ قرآن کریم میں فرعون کے غرق ہونے کا حال یوں بیان کیا گیا ہے: قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ءٰٓلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۷۷) ”(فرعون نے) کہا کہ میں اس (اللہ) پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں (بھی) مسلمانوں میں سے ہوں، (جواب دیا گیا) اب ایمان لاتا ہے؟ اس سے پہلے تو سرکشی کرتا رہا اور تو مفسدین میں شامل رہا“۔ ان آیات کی مذکورہ تفسیری روایت اپنی جگہ پر بالکل معقول ہے لیکن منکر حدیث غلام احمد پرویز نے حدیث کے مضمون میں معنوی تحریف کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ جبرئیلؑ نے سمندر کی مٹی فرعون کے منہ میں اللہ کے حکم سے اس لیے ڈالی تھی کہ وہ ایمان نہ لے آئے لیکن اللہ کی یہ تدبیر (معاذ اللہ) ناکام ہو گئی کہ فرعون نے پھر بھی اسلام کا کلمہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد لکھا ہے ”کیا آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ ہو گی؟“۔ (۱۷۸) حال آں کہ حدیث کا مضمون تو یہ ہے کہ فرعون نے کلمہ پہلے پڑھا تھا۔ اس کے منہ میں جبرئیلؑ نے سمندری مٹی بعد میں اس لیے ڈالی کہ اس وقت کا فرعون کا ایمان اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں تھا۔

۱۷۷۔ یونس: ۹۰۔۹۱

۱۷۸۔ مقام حدیث: ص ۱۷۰۔۱۷۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۰۔ سورۂ حجر میں ہے وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ[۱۷۹] ''اور تم میں سے آگے بڑھنے والے اور پیچھے ہٹنے والے (بھی) یقیناً ہمارے علم میں ہیں''۔ اس کے تحت مسٹر غلام احمد پرویز نے ترمذی کی یہ روایت نقل کی ہے ''ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک حسین ترین عورت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی''۔[۱۸۰] اس روایت کو ماہرینِ فن نے منکر اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کی دو اسناد بیان کی ہیں اور اس سند کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے جس میں ابن عباسؓ کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی یہ صرف ابی الجوزاء کا قول ہے حضرت ابن عباسؓ کا نہیں۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال کو اہل علم ہرگز منزل من اللہ اور وحی قرار نہیں دیتے جیسا کہ مسٹر پرویز صاحب لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے بھی مذکورہ آیت کی تفسیر میں اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اس روایت کے صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ جمعہ اور عیدین کے سوا روزمرہ کی نمازوں میں صرف فجر اور عشاء کی نمازوں میں خواتین کو مسجد نبوی میں آنے کی اجازت تھی۔ ان دنوں مسجد نبوی میں برقی قمقمے نہیں ہوتے تھے بل کہ مدہم سی روشنی والے چراغ ہوتے تھے جو محراب کے پاس رکھے ہوتے تھے تو پچھلی صفوں میں یہ عورت اگلی صف کے مردوں کو کیسے نظر آسکتی تھی؟ جن روایات کو خود ماہرین فن منکر اور ناقابل قبول قرار دیں تو انہیں اپنے موقف میں پیش کرنے کا منکرین حدیث کے پاس کون سا علمی اور اخلاقی جواز ہے؟

۱۱۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنا ختنہ بسوے سے کیا اور اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس تھی۔[۱۸۱] حضرت ابراہیمؑ ایک کافر گھرانے میں پیدا ہوئے لہٰذا بچپن میں ان کے ختنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ختنے کے احکام جب آپ پر نازل ہوئے تو اس وقت آپ کی عمر ۸۰ برس تھی اس لیے اگر انہوں نے اپنا ختنہ خود کر لیا تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے؟ اس زمانے میں عمریں نسبتہ طویل ہوا کرتی تھیں چناں چہ بہ مطابق بائیبل آپ کا انتقال ۱۷۵ برس کی عمر میں ہوا۔

۱۷۹۔ الحجر: ۲۴

۱۸۰۔ مقام حدیث: ص ۱۹۲

۱۸۱۔ مقام حدیث: ص ۳۰۵ بہ حوالہ بخاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ج۔ یہ قول منکرینِ حدیث بعض احادیث علم اور تجربے کے خلاف ہیں: اس الزام میں منکرین حدیث خود بھی فریب کا شکار ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ ایسی بعض احادیث کو یہاں زیر بحث لایا جاتا ہے جن پر منکرین حدیث کو اعتراض ہے:

ا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخر عمر میں ہمیں عشا کی نماز پڑھائی۔ سلام پھیرنے کے بعد آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ ارأیتم لیلتکم ھذا فان رأس مائة سنة منھا لا یبقی ممن ھو علی ظھر الارض احد"۔ (۱۸۲) "کیا تم نے اس رات کو دیکھا ہے، اب سے سو برس کے بعد جتنے لوگ اس وقت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی زمین پر (زندہ) باقی نہیں رہے گا"۔ اس حدیث سے منکرین حدیث یہ (غلط) تأثر پیش کرتے ہیں کہ دنیا سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی اور چوں کہ یہ تاریخی حقائق اور مشاہدے کے خلاف ہے لہٰذا یہ قول ان کے حدیث موضوع ہے۔ حال آں کہ یہ ہی حدیث صحیح بخاری میں کتاب الصلوٰۃ میں بھی موجود ہے جس کے کلمات یہ ہیں "فقال ارأیتم لیکتم ھذا فان رأس مائة سنة منھا لا یبقی ممن ھوا لیوم علی ظھر الارض احد" (۱۸۳) "تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اس رات کو دیکھا، اب سے سو سال کے بعد جتنے لوگ آج زمین کی پشت پر ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا"۔ اس حدیث میں "الیوم" کے کلمے سے بالکل واضح ہے کہ آپ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا کہ سو سال کے بعد نوع انسانی میں سے کوئی بھی زمین پر نہیں ہوگا بل کہ آپ نے یہ پیشگوئی فرمائی کہ جو لوگ آج روئے زمین پر موجود ہیں ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ان کی نسل ہی منقطع ہو جائے گی۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے غروب ہونے پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جانتے ہو سورج کہاں جاتا ہے (ابوذرؓ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا، وہ جاتا ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر (طلوع ہونے کی) اجازت طلب کرتا ہے تو اسے اجازت دے دی جاتی ہے اور عنقریب وہ وقت آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا تو قبول نہ ہوگا اور وہ اجازت مانگے گا لیکن اجازت نہیں ملے گی۔ اسے کہا جائے گا تو واپس پلٹ جا جہاں سے آیا ہے اور پھر وہ مغرب سے طلوع ہوگا اور یہ ہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا "والشمس تجری لمستقر لھا

۱۸۲۔ بخاری: کتاب العلم، رقم ۵۸ عن عبداللہ بن عمرؓ

۱۸۳۔ بخاری: کتاب الصلوٰۃ، باب ذکر العشاء والعتمۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذالک تقدیر العزیز العلیم"[۱۸۴] "اور آفتاب اپنے ٹھکانے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ مقرر کیا ہوا ہے زبردست (اور) علم والے (اللہ) کا"۔

یہاں منکرینِ حدیث کا اعتراض یہ ہے کہ سورج تو طلوع اور غروب ہوتا ہی نہیں بل کہ زمین اور دیگر سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ اعتراض اس لیے لغو ہے کہ انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے اور جو اس کا ظاہری مشاہدہ ہوتا ہے اسی کے مطابق سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے کلمات لسانی محاورات میں چلتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں سکندر ذوالقرنین کے متعلق سورۂ کہف میں ہے "حَتّٰیٓ اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا"[۱۸۵] "یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو اسے ایسا پایا کہ وہ ایک کیچڑ کی ندی میں ڈوب رہا ہے اور اس (ندی) کے پاس اس نے ایک قوم کو پایا"۔ اس طرح کی قرآنی آیات کی منکرین حدیث جو تاویل کریں گے وہی ان کے لیے اس حدیث میں کیوں ممنوع ہے؟ منکرین حدیث کا دوسرا اعتراض بھی قطعاً لغو ہے کہ سورج سجدہ کیسے کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ہےS وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ"[۱۸۶] "اور ستارے اور درخت (اللہ کو) سجدہ کرتے ھیں"۔ نیز ارشادھے " وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ[۱۸۷] "اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی صبح و شام (اللہ کو) سجدہ کرتے ہیں"۔ ان قرآنی آیات میں سجدے کی جو تشریح اور تاویل منکرین حدیث کرتے ہیں وہ اس حدیث میں ان کے لیے کیوں ممنوع ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں نماز والا تشریعی سجدہ مراد نہیں بل کہ تکوینی سجدہ مراد ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز اللہ کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے۔ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے پر اعتراض لغو ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے وہ جس سیارے یا ستارے کی حرکت کو پلٹ دے تو اس پر کوئی عقلی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اجرام فلکی پر جو "طلوع و غروب" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ ظاہری انسانی محسوسات کی ترجمانی

۱۸۴۔ بخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفۃ الشمس والقمر

۱۸۵۔ الکہف: ۸۶

۱۸۶۔ الرحمن: ۶

۱۸۷۔ الرعد: ۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتی ہے اور یہ تمام اجرام فلکی اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے قوانین فطرت (تکوینی قوانین) کی پابندی کرتے ہیں یہ ہی ان کا سجدہ ہے اور ان ہی طبعی قوانین کی برقراری کی سورج اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس اجازت کی نوعیت کو ہم اگر نہ بھی سمجھ سکیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقائق کا وجود یا عدم وجود ہمارے انہیں سمجھ پانے یا سمجھ نہ پانے پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے: وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ (۱۸۸) ” اور (اس کائنات کی) کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس (اللہ) کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان چیزوں کی (اس) تسبیح کو نہیں سمجھتے“۔ پس یہاں خلاف عقل اور بالائے عقل میں فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کوئی بھی خلاف عقل بات قابل قبول نہیں ہو سکتی لیکن اگر کچھ باتیں یا چیزیں کچھ لوگوں کی یا سب کی عقل سے بالاتر ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور جو حقائق بالائے فہم و عقل ہیں ان کی نفی نہیں ہو جاتی۔

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب گرمی کی شدت ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے (یعنی گرمی کی شدت کم ہونے پر) پڑھو فانّ شدة الحرّ من فیح جهنم فاشتکت النار الیٰ ربها فقالت یا رب أکل بعضی بعضا فاذن لها بنفسین نفس فی الشتاء ونفس فی الصیف وهو اشد ماتجدون من الحر و هو اشد ماتجدون من الزمهریر (۱۸۹) ”کیوں کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے۔ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی کہ اے میرے رب! میرے ایک حصے نے دوسرے کو کھا لیا۔ اللہ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس کی موسم سرما میں اور ایک سانس کی موسم گرما میں۔ اور (گرمی کا سانس) وہ سخت گرمی ہے جو تم محسوس کرتے ہو اور (سردی کا سانس) وہ سخت ترین سردی ہے جو تم محسوس کرتے ہو“۔

اس طرح کی احادیث پر بھی منکرینِ حدیث کا اعتراض لغو ہے۔ ماہرین طبیعات مادی اسباب ومسببات (Causes and effects) کے سلسلے سے بحث کرتے ہیں۔ مابعد الطبیعاتی مسائل (Meta-physical issues) ان کے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔ مثلاً کسی شخص کی موت کا سبب طبی ماہرین حرکت قلب کا بند ہونا، دماغی شریان کا پھٹ جانا وغیرہ وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ مرنے والے کی روح موت کے فرشتے نے قبض کر لی ہے۔ اس لیے وہ موت سے دوچار ہوا

۱۸۸۔ بنی اسرائیل: ۴۴

۱۸۹۔ بخاری: کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ابراد بالظہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اسی طرح زمین پر موسمی تغیرات کے جو اسباب اور مسببات، ماہرین موسمیات بیان کرتے ہیں ان کا تعلق بھی محض ظاہری اور مادی اسباب سے ہے۔ عربی زبان میں لفظ "مِن" بمعنی "سے" بیان جنس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس زیر بحث حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں گرمی کی شدت جہنم کی گرمی سے مشابہہ ہے۔ گرمی کا مخزن اور مرکز سورج محض ایک ستارہ ہے۔ اس طرح کے لاتعداد ستارے اس کائنات میں اور بھی موجود ہیں۔ اگر ان ستاروں کی گرمی کا اصل مرکز جہنم ہو تو اس میں کون سا اشکال ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اگر جہنم کو سخت گرم بنایا ہے تو وہی اسے شدید سرد بنانے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں موسموں کی جو گرمی اور سردی ہم محسوس کرتے ہیں اسے جہنم کی دو سانسوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بخار جہنم کے جوش سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا تم اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔[190] اس حدیث کا تعلق بھی مابعد الطبیعات سے ہے۔ حرارت خواہ جسم کے اندر ہو یا باہر ہو یعنی حرارت اور گرمی کسی بھی طرح کی ہو، اگر اس کا تعلق حرارت کے اصل ماخذ جہنم سے ہو تو یہ عقلاً عین ممکن ہے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو مارنے کا حکم دیا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔[191] بعض دوسرے موذی جانوروں کی طرح گرگٹ بھی موذی جانور ہے اور اس کی انسان دشمنی کا حال یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو ان کے مخالفین نے آگ میں ڈالا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی تھی۔ حدیث میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ آگ گرگٹ کی پھونکوں سے بھڑک اٹھی تھی بل کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ گرگٹ اس آگ کو بھڑکانے کی کوشش کرتا رہا۔ الغرض اس حدیث پر بھی منکرینِ حدیث کا اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا۔

۵۔ حدیث میں ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤدؑ نے ایک مرتبہ کہا کہ آج شب میں اپنی سو یا ننانوے بیویوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شہ سوار پیدا کریں گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ کسی ہم نشین نے کہا کہ آپ انشاء اللہ کہیں لیکن آپ بھول گئے۔ پس ان میں سے صرف ایک عورت ہی حاملہ ہوئی اور اس نے بھی آدھا بچا جنا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر وہ انشاء اللہ کہتے تو سب عورتوں کے بچے ہوتے اور بے شک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد

۱۹۰۔ مقام حدیث: ص ۳۲۳

۱۹۱۔ بخاری: کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے۔ (۱۹۲) منکرین حدیث کے لیے یہاں بھی اعتراض کا کوئی موقع نہیں۔ بہ مطابق بائبل حضرت سلیمانؑ کی سات سو لونڈیاں اور تین سو بیویاں تھیں۔ (۱۹۳) اگر قرآن کریم کی رو سے حضرت سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولیاں سمجھنے ہُدہُد سے ہم کلام ہونے، چیونٹی کی بات سمجھنے، سرکش جنات کو ان کے تابع ہونے، تختِ سلیمانی کے ہوا میں اڑنے اور ہوائی جہاز کا کام دینے وغیرہ جیسے حیران کن معجزات عطا کر رکھے تھے۔ (۱۹۴) نو سو بیویوں کے پاس جانے کی طاقت اور ایک ہی رات کے اوقات میں برکت اللہ تعالیٰ نے بہ طریقِ معجزہ عطا فرمائی تو انکار یا تعجب کی کونسی بات ہے؟

۶۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ حضرت آدمؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو ان کا قد ساٹھ ذراع (ہاتھ) تھا۔ اس کے بعد انسانوں کا قد گھٹتا چلا گیا۔ حدیث میں لفظ "ذراع" کا معنی "ہاتھ" ہے، "گز" نہیں جیسا کہ منکرینِ حدیث نے لکھا ہے۔ (۱۹۵) اس روایت پر اعتراض بھی صحیح نہیں۔ پچھلے زمانوں میں صرف قد ہی نہیں عمریں بھی بہت لمبی ہوا کرتی تھیں، مثلاً حضرت نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نو سال رہے۔ (۱۹۶) اور مثلاً قوم عاد کے لیے قد و قامت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ ان پر انتہائی تیز و تند ہوا کا طوفان آیا تو ان کا حال یہ تھا: تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ" (۱۹۷) "یہ (تیز و تند ہوا) نہیں اٹھا اٹھا کر یوں پٹخ رہی تھی گویا کہ وہ جڑ سے کٹے ہوئے کھجور کے تنے ہیں"۔

۷۔ شیطان نماز کی اذان سے پیٹھ پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگتا ہے اور اذان کی آواز نہیں سنتا۔ پھر جب نماز کے لیے تکبیر کہی جاتی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے، پھر جب تکبیر کہنے والا سکوت کرتا ہے تو سامنے آجاتا ہے اور نمازی کو اِدھر اُدھر کی باتیں یاد دلاتا ہے جس سے نمازی بھول جاتا ہے کہ کس قدر نماز پڑھی۔ (۱۹۸) اگر شیطان کا خارجی وجود قرآن کریم کے متعدد مقامات سے بہ خوبی

۱۹۲۔ مقام حدیث: ص ۳۰۵ بہ حوالہ بخاری

۱۹۳۔ بائبل۔ سلاطین ۱۱:۳

۱۹۴۔ النمل: ۱۶۔۲۸۔ الانبیاء: ۸۱۔۸۲

۱۹۵۔ مقام حدیث: ص ۳۱۷

۱۹۶۔ العنکبوت: ۱۴

۱۹۷۔ القمر: ۲۰

۱۹۸۔ مقام حدیث: ص ۲۳۰ بہ حوالہ بخاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثابت ہے تو حدیث پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ انسان کا بھول جانا بعض اوقات شیطان کے اثرات اور دل میں ڈالے جانے والے اس کے وسوسوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً حضرت یوسفؑ نے قید خانے میں اپنے اس ساتھی سے جس کی رہائی کا آپ کو گمان تھا، یہ کہا کہ اپنے آقا (شاہِ مصر) سے میرا بھی ذکر کرنا: فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ[199] "تو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے (یوسفؑ کا) ذکر کرنا بھلا دیا"۔

۸۔ یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ نے چوہوں کو بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی مسخ شدہ نسل قرار دیا۔[200] یہ روایت صحیح مسلم کتاب الزھد میں بھی موجود ہے اور وہیں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی ملتی ہے کہ جس قوم پر مسخ کا عذاب آئے وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول غیر مُدرک بالقیاس ہے۔ یعنی یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انہوں نے محض عقل اور رائے سے یہ فرمایا ہو بلکہ اس کی حیثیت مرفوع حدیث کی ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں اگر بنی اسرائیل کے ایک گروہ کے متعلق خیال آیا تو اس کی تائید وحی الٰہی سے نہیں ہوئی جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے واضح ہو چکا ہے۔

۹۔ حدیث میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے خاوند سے خیانت نہ کرتی۔[201] بنی اسرائیل کے لیے وادیِ تیہ میں غذا کا مسئلہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں غیبی رزق من و سلویٰ سے نوازا۔ یہ رزق انہیں روزانہ ملتا تھا لیکن منع کرنے کے باوجود وہ بیٹروں کے گوشت کا ذخیرہ کرنے لگے جس سے گوشت گلنے سڑنے لگا۔ ان سے پہلے لوگوں میں اس طرح ذخیرہ اندوزی کی عادت نہیں تھی۔ اسی طرح حضرت حواؑ پہلی خاتون ہیں۔ ان سے پہلے دنیا میں نہ کوئی عورت تھی اور نہ ہی اس کا کوئی شوہر تھا۔ حضرت حوا کی خیانت یہ تھی کہ وہ ابلیس کے فریب میں آ گئیں اور پھر اپنے خاوند کو اس درخت کے قریب جانے پر آمادہ کر ہی لیا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع فرمایا تھا۔ قرآن کریم میں ہے: فازلّھما الشیطن کہ ان دونوں کو شیطان نے بہکایا۔ شیطان کے بہکانے کا اثر پہلے حضرت حوا نے اور پھر ان کے ذریعے حضرت آدمؑ نے بھی قبول

۱۹۹۔ یوسف: ۴۲

۲۰۰۔ مقام حدیث: ص ۳۳۲

۲۰۱۔ ایضاً: ص ۳۳۳ بہ حوالہ بخاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا، جیسا کہ موجودہ بائبل کا بھی یہ ہی مضمون ہے۔ سابقہ آسمانی کتب اگرچہ محرف ہیں لیکن ان کے کسی مضمون کی قرآن یا قولِ رسول سے تائید ہوتی ہو تو وہ صحیح ہے۔ قرآنی کلمات: فازلّھما الشیطن سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت آدمؑ و حوا دونوں ایک ہی وقت میں شیطان کے بہکاوے میں آئے تھے۔ صرف یہ ہی واضح ہوتا ہے کہ دونوں کو شیطان نے بہکایا۔

۱۰۔ حدیث میں ہے کہ مرغ کی آواز سننے پر اللہ سے اس کا فضل طلب کرو، کیوں کہ وہ فرشتے کو دیکھتا ہے اور جب تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگو کیوں کہ وہ شیطان کو دیکھتا ہے تب بولتا ہے۔ مرغ کی آواز کو عام لسانی محاورات میں بانگ یا اذان کہا جاتا ہے۔ یہ آواز انسان کو مرغوب ہوتی ہے جس سے انسان کی توجہ اللہ کی یاد کی طرف ہوتی ہے۔ فرشتے کے نظر آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرغ، گدھے یا دیگر حیوانات کے بعض محسوسات تو ایک طرف رہے، انسانوں کو بعض اوقات انسانوں کے محسوسات کا بھی اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر علم نہیں ہو سکتا، چناں چہ مرنے والا اگر نیک شخص ہے تو موت سے پہلے اس پر رحمت کے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور وہ اسے بشارت دیتے ہیں لیکن فرشتوں کے اس نزول اور بشارت کا دوسروں کو علم نہیں ہوتا۔ سورہ حٰم سجدہ میں ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ[۲۰۲] "بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ تم کوئی خوف نہ کرو اور نہ ہی غم کرو اور (اس) جنت کی خوش خبری ہم سے سن لو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیوی زندگی میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمھارے دوست ہیں) اور وہاں جو تم چاہو گے تمہیں ملے گا۔ یہ (اس اللہ کی طرف سے) مہمانی ہے جو بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے"۔ مرنے والا اگر کافر ہو تو اس پر عذاب کے فرشتے اترتے ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے: وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوۡۤا اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ کُنۡتُمۡ عَنۡ اٰیٰتِہٖ

۲۰۲۔ حٰم السجدہ: ۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تَسْتَكْبِرُوْنَ (۲۰۳) ” اور کاش تو اس وقت دیکھے جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے (ان کی طرف) اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوتے ہیں کہ ہاں! نکالو اپنی جانیں، آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس لیے کہ تم اللہ کے ذمے جھوٹی باتیں لگاتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے“۔

اگر عالم نزع کی حالت میں رحمت یا عذاب کے فرشتے دوسروں کو نظر نہیں آتے یا مرنے والے سے ان کا مکالمہ دوسرے لوگ نہیں سنتے تو منکرینِ حدیث کو ان قرآنی آیات کا بھی انکار کر دینا چاہیے۔ پس اگر منکرینِ حدیث کو بلکہ کسی کو بھی اگر مرغ کو دکھائی دینے والا فرشتہ یا گدھے کو نظر آنے والا شیطان دکھائی نہ دے تو اس پر بھی پریشان یا حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہاں بھی زیرِ بحث حدیث سے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ مرغ کی مرغوب بانگ انشراحِ قلب اور گدھے کی مکروہ ہینگ انقباضِ قلب پیدا کرتی ہے۔ انشراحِ قلب میں ملائکہ کے اثر اور انقباضِ قلب میں شیطان کے اثر کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دخل ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ صلح نامہ حدیبیہ سے پہلے عروہ بن مسعود ثقفی اہل مکہ کی طرف سے سفیر بن کر حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ اس نے واپس جا کر قریش سے کہا: ”میں روم، ایران اور حبش کے بادشاہوں کے دربار میں بھی گیا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے یہ نہیں دیکھا کہ لوگ کسی بادشاہ کی ایسی تعظیم کرتے ہوں، جیسے محمد ﷺ کی تعظیم آپ کے اصحاب کرتے ہیں۔ اگر آپ تھوکتے بھی ہیں تو کوئی اسے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اپنے منہ اور بدن پر مل لیتا ہے اور جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں اور جب آپ وضو کرتے ہیں تو وضو کے پانی کے لیے ایسا لگتا ہے کہ وہ لڑ پڑیں گے۔ اور جب آپ بات کرتے ہیں تو وہ اپنی آوازوں کو پست کر لیتے ہیں اور ادب و تعظیم کی وجہ سے وہ آپ کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتے“۔ (۲۰۴)

غلام احمد پرویز نے اس روایت کا مذاق اڑاتے ہوئے اس کا عنوان ”نفاست“ قائم کیا ہے جس کے تحت ازراہِ اعتراض لکھا ہے ”رسول اللہ ﷺ نے جتنی مرتبہ تھوکا وہ کسی نہ کسی شخص کے ہاتھ پر پڑا اور اس نے اپنے چہرہ اور بدن پر مل لیا“۔ (۲۰۵) غور کیجیے عروہ بن مسعود نے حالت کفر و شرک میں رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام کی سچی عقیدت و محبت کو کس طرح بیان کیا ہے اور یہ منکرین حدیث اسے کس طرح نفاست کے

۲۰۳۔ الانعام: ۹۳

۲۰۴۔ بخاری: کتاب الشروط، باب الشرط فی الجہاد والمصالحۃ

۲۰۵۔ مقام حدیث: ص ۳۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاف خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لعابِ مبارک کو اپنے گندے اور ناپاک منہ کے لعاب پر قیاس کرلیا۔ تف ہے ایسی عقل پر!

۱۲۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو۔ اسی طرح صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے مٹا دے گا اور تمھاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے گا جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہ کرے اور پھر خدا سے مغفرت و بخشش طلب کرے۔[۲۰۶] ان احادیث پر اعتراض بھی غلط ہے۔ ہر صحیح العقیدہ مسلمان جس کی موت عقیدۂ توحید پر ہوتی ہے اور وہ اللہ کے ساتھ شرک سے بچتا ہے تو وہ زود یا بہ دیر یقیناً جنت میں جائے گا۔ اگر وہ گناہ گار ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں جائے اور ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے گناہ گاروں کو اللہ تعالیٰ ویسے ہی بخش دے۔ چناں چہ جہاں قرآن و سنت میں متعدد گناہوں پر سزا کی وعید سنائی گئی ہے تو قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا گیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ[۲۰۷] "بے شک اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں کو وہ جس کے لیے چاہے (سزا دیے بغیر) بخش دے گا"۔ دوسری حدیث پر بھی کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اگر نوعِ انسانی کے سب کے سب افراد معصوم عن الخطاء ہوتے اور کسی سے بھی کوئی گناہ سرزد نہ ہوا کرتا جیسے فرشتے معصوم عن الخطاء ہیں تو ایسی معصوم عن الخطاء مخلوق فرشتے تو پہلے ہی موجود تھے، نئی مخلوق (انسان) کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں گناہ کا مادہ رکھا ہی نہیں۔ انسان میں نیکی اور بدی دونوں کا احساس اور دونوں کی قوت و صلاحیت رکھ دی (فالهمها فجورها و تقواها)۔ تاکہ نیکی پر لوگوں کو اچھا صلہ (ثواب) حاصل ہو اور بدی پر برے صلہ (عذاب) سے انہیں دوچار ہونا پڑے یوں اللہ تعالیٰ کی جمالی اور جلالی دونوں طرح کی صفات کا کامل ظہور ہو۔ اگر گناہ گار توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت و رحمت کا بھرپور ظہور ہو۔ چناں چہ سورۂ زمر میں ہے: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ

۲۰۶۔ مقام حدیث: ص ۳۳۱ بہ حوالہ بخاری ایضاً بہ حوالہ مسلم

۲۰۷۔ النساء: ۱۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ "[۲۰۸] (اے پیغمبر! میری جانب سے) تو کہہ دے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے"۔

پس اس طرح کی آیات اور احادیث کا مطلب لوگوں کو مایوسی سے بچانا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر انہیں بھرپور رغبت دلانا ہے۔ اس حدیث کا مطلب بھی یہ ہی ہے کہ انسان فرشتہ نہیں، اس سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہو ہی جاتا ہے۔ اس لیے مایوس ہونے کی بہ جائے اپنے گناہوں پر اللہ سے مغفرت طلب کیا کرو اور اللہ کی طرف رجوع کرو۔ چناں چہ مذکورہ بالا قرآنی آیت کے بعد اگلی آیت یہ ہے: وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ "[۲۰۹] اور تم سب اپنے رب کی طرف جھک جاؤ اور اس کی فرمانبرداری کرو اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے (اور) پھر تمھاری کوئی مدد نہ کی جائے"۔ پس موت سے پہلے توبہ کا دروازہ کھلا ہے کفر و شرک سمیت ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے اگر انسان اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار ہو جائے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے۔

۱۳۔ عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندریا کو دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے زنا کیا تھا تو اسے ان سب نے سنگ سار کیا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ سنگسار کیا۔[۲۱۰] صحاح ستہ کو "صحاح" تغلیباً کہا جاتا ہے کہ ان میں موجود اکثر احادیث محدثین کی نظر میں صحیح ہیں۔ صحاح ستہ یا حدیث کی دیگر کتب کی جن احادیث اور روایات کے صحیح ہونے میں خود محدثین اور ماہرین فن کلام کرتے ہیں تو منکرین حدیث کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس طرح کی روایات کو اپنے موقف کی تائید میں پیش کریں اور لوگوں کو دھوکہ دے کر انہیں صحیح احادیث سے متنفر کرنے کی سعی نامشکور میں لگے رہیں۔ زیر نظر روایت ہرگز (پھر دہرائیے) ہرگز رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بل کہ کسی صحابی کا بھی قول نہیں یہ صرف عمرو بن میمون تابعی کا قول ہے۔ محدث حمیدیؒ کا بیان ہے کہ یہ روایت امام بخاریؒ کی کتاب "التاریخ الکبیر" میں بھی ہے لیکن وہاں قد زنت (اس بندریا نے زنا کیا تھا) کے الفاظ نہیں ہیں

۲۰۸۔ الزمر: ۵۳

۲۰۹۔ الزمر: ۵۴

۲۱۰۔ مقام حدیث: ص ۳۳۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر قدزنت کے الفاظ صحیح بھی ہوں تو امام بخاریؒ نے یہ روایت صرف اس لیے بیان کی ہے کہ عمرو بن میمون کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب ہر طرح کے جرائم اور گناہوں میں ملوث رہتے تھے۔ شراب نوشی بھی عام مشغلہ تھا۔ نشے کی حالت میں بعض اوقات انسان "توہمات" کو بھی "حقائق" سمجھ لیتا ہے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ دورِ جاہلیت میں عمرو بن میمون کی یہ خطائے بصری (Hallucination) ہو۔ الغرض عمرو بن میمون تابعی ہوں یا کوئی بھی ہو اس کا دورِ جاہلیت کا کوئی خیال یا گمان ناقابل التفات ہے۔ مزید برآں روایت کی صحت اصول روایت کے علاوہ اصول درایت کی روشنی میں بھی پرکھی جاتی ہے۔ چوں کہ بندر شریعت کے مکلف نہیں لہٰذا روایت قابل قبول نہیں۔

۱۴۔ سورۂ حدید میں ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ [۲۱۱] "وہی (اللہ) پہلے ہے، وہی پیچھے، وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی اور وہ ہر چیز کو بہ خوبی جاننے والا ہے"۔ وہی اول ہے یعنی اس سے پہلے کچھ نہ تھا، وہی آخر ہے یعنی اس کے بعد کوئی چیز نہ ہوگی، وہی ظاہر ہے یعنی وہ سب پر غالب ہے، وہی باطن یعنی باطن کی ساری باتوں کو وہی پوری طرح جانتا ہے یا وہ لوگوں کی نظروں اور عقلوں سے پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ دعا پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی: اللّٰھم انت الاول فلیس قبلک شئی وانت الاٰخر فلیس بعدک شئیٍ وانت الظاہر فلیس فوقک شئیٍ وانت الباطن فلیس دونک شئیٍ [۲۱۲] اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اول، آخر، ظاہر، باطن کی تفسیر بیان فرما دی گئی ہے۔ آیت مذکورہ کی اس صحیح تفسیر سے آنکھیں بند کر کے حدیث پر اعتماد کو مجروح کرنے کے لیے منکر حدیث غلام احمد پرویز نے ترمذی ابواب التفسیر سورۂ حدید کی وہ روایت بیان کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ زمین سے آسمان پانچ سو سال کی راہ ہے جس کے آخر میں ہے کہ کوئی اس زمین کے اسفل ترین طبقہ سے اوپر کو رسی لٹکائے تو وہ ٹھیک اللہ کے اوپر جا کر گرے گی" [۲۱۳] اس روایت کے متعلق خود امام ترمذیؒ نے بیان کر دیا ہے کہ اس کی سند منقطع ہے۔ اس سند میں حسن کی حضرت ابوہریرہؓ سے سماعت ثابت ہی نہیں۔ یعنی یہ روایت خود امام ترمذیؒ کے نزدیک ہرگز معتبر نہیں۔

۲۱۱۔ الحدید: ۳

۲۱۲۔ صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء، باب مایقول عند المنام واخذ المضجع

۲۱۳۔ مقام حدیث: ص ۱۷۲

© rasailojaraid.com